اس شمارے کے اہم مضامین
ڈاکٹر اسرار احمد کے قلم سے مفصل عرض احوال
اور متحدہ شریعت محاذ اور تنظیم اسلامی

وقد اخذ میثاقکم ان کنتم مؤمنین

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی
۳۶-کے ماڈل ٹاؤن ۰ لاہور

PEPSI

MIRINDA

پنجاب بیوریجز کمپنی لمیٹڈ۔ فیصل آباد۔ فون نمبر: ۰۲۶۰۳۷ / [illegible]

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُم بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد — ۳۵

شمارہ — ۱۱

نومبر ۱۹۸۶ء

بمطابق

ربیع الاول ۱۴۰۷ھ

زرِ سالانہ ۴۰/- روپے

فی شمارہ ۴/- روپے

اس شمارے کی قیمت ۵ روپے

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

حافظ عاکف سعید

مینجنگ ایڈیٹر: اقتدار احمد

مکتبہ تنظیم اسلامی ۳۶-کے، ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۴ فون ۸۵۲۶۸۳

سب آفس: ۱۱- داؤد منزل، نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی، فون ۲۱۶۵۸۲

چودھری رشید احمد

مشمولات

- عرضِ احوال ——— ۳
  ——— ڈاکٹر اسرار احمد
- قندِ مکرّر ——— ۱۹
  ——— 'میثاق' (تحریر: مولانا امین احسن اصلاحی)
  ——— 'تذکرہ وتبصرہ' (شائع شدہ: جولائی ۶۶ء)
- متحدہ شریعت محاذ اور تنظیمِ اسلامی ——— ۲۹
  ——— ڈاکٹر اسرار احمد
- شہادتِ عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ کا تاریخی پس منظر۔ ۳۷
  فلسفۂ انقلاب کی روشنی میں
  ——— ڈاکٹر اسرار احمد
- الہُدیٰ (نشست ۳۹) ——— ۵۹
  بندۂ مومن کی شخصیت کے خدوخال
  ——— ڈاکٹر اسرار احمد
- بابُ الاسلام سندھ مسائل اور ان کا حل ——— ۶۷
  جناب اسداللہ بھٹو کا انٹرویو
  ——— مرتّب: مقبول الرحیم مفتی
- منتخب تعزیتی خطوط ——— ۸۳
  برسانحۂ ارتحال عزیزان عبداللہ طاہر سیال و محمد حمید احمد
- افکار و آراء ——— ۹۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عرضِ احوال

راقم الحروف کو قارئینِ 'میثاق' کی اس حق تلفی کا شدت کے ساتھ احساس ہے کہ اُن کے ساتھ براہِ راست خطاب کے ضمن میں آٹھ ماہ بعد قلم اٹھانے کی نوبت آئی بھی ہے تو بسلسلہ 'تذکرہ وتبصرہ' نہیں بلکہ صرف بغرضِ 'عرضِ احوال'!

اس عرصے کے دوران 'تذکرہ وتبصرہ' کے ذیل میں اکثر و بیشتر راقم کی تقاریر شائع ہوتی رہی ہیں جنہیں مختلف رفقاء کار اوّلاً کیسٹ کی ریل سے صفحہ قرطاس پر منتقل کرتے رہے اور اس کے بعد قدرے نوک پلک سنوار کر شائع کرتے رہے —— اس سے یہ فائدہ تو کسی نہ کسی درجے میں حاصل ہو گیا کہ راقم کے ساتھ قارئین کا ذہنی رابطہ قائم رہا لیکن کچھ غلط فہمیاں اور ان کے نتیجے کے طور پر شکر رنجیاں بھی پیدا ہوئیں —— اس لئے کہ اوّل تو تقریر کا معاملہ تحریر سے ویسے ہی بنیادی طور پر مختلف ہوتا ہے، راقم کو تو کہنہ مشق خطیب یا منجھا ہوا مقرر ہونے کا دعویٰ ہی نہیں ہے، بڑے سے بڑا مقرر بھی کسی خاص موضوع پر تقریر کرتے ہوئے اس کے جملہ پہلوؤں کا احاطہ اور ان کے مابین توازن اتنا برقرار نہیں رکھ سکتا جتنا تحریر میں ممکن ہوتا ہے۔ لہٰذا کسی تقریر میں مسئلہ زیرِ بحث کے کسی ایک پہلو پر اتنا زور کہ دوسرا پہلو دب کر رہ جائے عین قرینِ قیاس ہے —— پھر تقریر کی اشاعت کے متذکرہ بالا مراحل، بالخصوص "نوک پلک سنوارنے" اور "حک و اضافہ" کے دوران جو کارکن بھی یہ خدمت سرانجام دیتا ہے اس کے اپنے ذہن کا دَر آنا بھی صرف قرینِ عقل ہی نہیں عین مطابقِ واقعہ ہے ——!!

کچھ ایسی ہی صورتِ حال اس عرصے کے دوران راقم کی بعض تقاریر کی اوّلاً 'میثاق' اور پھر بعض اخبارات میں اشاعت سے پیش آئی ہے. خیال یہ تھا کہ اب جب بھی قلم اٹھاؤں گا ان کے ضمن میں پیدا شدہ مغالطوں کو رفع کر کے اپنے موقف کو بہ تمام و کمال اور توازن و اعتدال کے ساتھ پیش کر دوں گا۔ لیکن "عَرَفْتُ رَبِّیْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ" کے مصداق تم "لمبے لمبا

آرزو کہ خاک شدہ!" والا معاملہ رہا ہے ـــــ اس لئے کہ گذشتہ پورے دو ماہ سے شدید ہنگامی حالات کا سامنا رہا ہے اور 'عرضِ احوال' کے ضمن میں یہ چند سطور بھی روا روی ہی میں سپردِ قلم ہو رہی ہیں۔ بہرحال ارادہ یہی ہے کہ ان شاء اللہ جلد ہی قارئین کا 'قرض' ادا کرنے کی کوشش کرونگا۔ واللہ الموفق والمستعان!

گذشتہ اشاعت کے ذریعے اُس اندوہناک حادثہ کی مختصر اطلاع تو قارئین تک پہنچ چکی ہے جو ۲۷ ستمبر ۸۶ء کو خانیوال سے جانبِ لودھراں اٹھارہ میل کے فاصلے پر دُنیا پور کے قریب پیش آیا جس میں راقم کے ایک بھانجے عبداللہ طاہر سیال جو میرے چھوٹے بھائی اقتدار احمد کے داماد بھی تھے ـــــ اور راقم کے بھتیجے محمد حمید احمد جو برادرم اقتدار احمد کے صاحبزادے اور راقم کے داماد تھے عین جوانی کے عالم میں اس عالمِ فانی سے راہیٔ ملکِ بقا ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ہمارے ملک میں سڑک کے حادثے روزانہ کا معمول بن گئے ہیں اور ہماری شاہراہوں نے موت کے دریاؤں کی صورت اختیار کر لی ہے جن پر ہر روز بیسیوں قیمتی جانیں تلف ہو جاتی ہیں۔ ان حادثوں پر ہر مومن کے اعزہ و اقارب کے گھروں میں تو صفِ ماتم بچھتی ہی ہے، روابط اور تعلقات کی وسعت کی نسبت سے سینکڑوں اور ہزاروں کو صدمہ اور رنج بھی ہوتا ہے ـــــ باقی سب کے لئے ہر حادثہ ایک 'خبر' کا درجہ رکھتا ہے۔ لیکن جن گھروں کے چراغ اس طرح اچانک گل ہو جائیں کہ صبح کو خوش و خرم اور چاق و چوبند حالت میں گھر سے روانہ ہوئے ہوں اور شام یا رات کو ان کی مسخ شدہ لاشیں واپس آئیں ان پر جو قیامتِ صغریٰ ٹوٹتی ہے اس کا کسی قدر اندازہ ہر صاحبِ احساس انسان کر سکتا ہے۔!

حادثات کی اس کثرت کا ایک سبب تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں جس تیز رفتاری سے برق رفتار کاروں اور دیو ہیکل اور فیل پیکر ٹرکوں اور ٹرالروں کا اضافہ ہوا ہے سڑکوں اور شاہراہوں کی صحیح اصولوں اور مسلّمہ معیارات کے مطابق تعمیر، ان پر نشانات اور انتباہات کی صحیح اور مناسب تنصیب اور سب سے بڑھ کر ڈرائیوروں میں ٹریفک کے قواعد و ضوابط کی پابندی کے احساس و شعور میں اضافہ اس کے مقابلے میں عشرِ عشیر بھی نہیں ہے۔ چنانچہ اس خاص واقعے میں سوا یہ کہ ایک جانب تو ہمارے مرحوم عزیز جس سڑک پر جا رہے تھے وہ بڑی شاہراہ (MAIN HIGHWAY) کا درجہ رکھتی ہے ـــــ اور دوسری سڑک جو

اسے قطع کرتی ہے چھوٹی ہے۔ چنانچہ اصولاً چھوٹی سڑک سے آنے والی گاڑی کو زیادہ محتاط ہونا چاہیئے تھا لیکن غالباً یہاں بھی " صاحبِ قوت ہی صاحبِ حق بھی ہے ! " (MIGHT IS RIGHT) والا اصول کارفرما ہے کہ دیو ہیکل ٹرک اپنا حق مقدم سمجھتے ہیں خواہ وہ مین روڈ پر ہوں خواہ چھوٹی سڑک پر ! ثانیاً جس چوک میں یہ حادثہ پیش آیا اس کو کثرتِ حادثات کی بنا پر علاقہ کے لوگوں نے تو " خونی چوک " کا نام دے دیا ہے لیکن شاہراہوں کے انتظام و انصرام کے ذمہ دار لوگوں کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ ایک خاص مقام پر حادثات کی کثرت کا سبب معلوم کر کے اس کے سدباب کی کوشش کریں۔

عوامی شعور کے فقدان، ڈرائیوروں اور بالخصوص ٹرک ڈرائیوروں کی بے حسی اور حکام کی نااہلی پر مستزاد سب سے بڑی لعنت رشوت کی ہے جس نے مجرموں کو سزا و عقوبت سے بالکل بے خوف و بے نیاز کر دیا ہے۔ چنانچہ پولیس کی کثرتِ تعداد اور تھانوں کی بہتات اور وسیع و عریض عدالتی نظام کے باوجود ملک جنگل کے راج کا نقشہ پیش کر رہا ہے۔ الغرض معاملہ وہ ہے کہ محمد " تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم ! "

ہمارے جو عزیز ' مرحومین ' کی فہرست میں شامل ہو گئے ہیں ان میں سے عبداللہ طاہر سیال کی عمر ۳۱ برس تھی، تعلیم اور پیشہ کے اعتبار سے سول انجینئر تھے اور ایک جانب اپنے فن میں نہایت ماہر و قابل تھے تو دوسری جانب بنیادی شخصیت کے اعتبار سے ذہانت اور شرافت کے امتزاج کا مظہرِ کامل تھے[1] ـــــ جو ہمارے معاشرہ میں بہت نادر و کم یاب ہے' ان کے والد اور ہمارے بہنوئی اللہ بخش سیال صاحب جماعت اسلامی کے نہایت قدیم اور حد درجہ مخلص، مستقل مزاج اور انتھک کارکن ہیں۔ انہوں نے اس عظیم صدمے کو جس صبر و ہمت کے ساتھ برداشت کیا ہے وہ ہر دیکھنے والے اور واقفِ حال کے لئے ایک قابلِ تقلید مثال ہے۔ مرحوم اگرچہ ذاتی زندگی میں دیانت و صداقت اور خودداری اور غیرت مندی ایسے اوصاف

---

[1] ہمارے نزدیک اعزّہ و اقارب میں دورانِ تعلیم امتحانات میں زیادہ نمبر حاصل کرنے میں راقم الحروف کے میٹرک میں حاصل کردہ نمبروں کو ایک " ریکارڈ " کا درجہ حاصل تھا یعنی ساڑھے آٹھ سو میں سے سات سو اٹھارہ ـــــ اس ریکارڈ کو ہماری دوسری نسل یعنی بہنوں بھائیوں کی اولاد میں سے مرحوم عبداللہ طاہر نے توڑا تھا۔ جب کہ انہوں نے نو سو میں سے آٹھ سو پانچ نمبر حاصل کئے۔

حسنہ سے بتمام و کمال متصف تھے اور مذہب کے بھی پابند تھے تاہم ان کی مذہبیت نے تاحال فعّال تحریکیت کی صورت اختیار نہیں کی تھی۔ اور اس کا سبب غالباً یہ تھا کہ وہ ابھی جماعتِ اسلامی اور تنظیم اسلامی کے مابین 'مذبذب' تھے۔ تاہم راقم کو قوی امید تھی کہ وہ جلد ہی اس معاملے میں اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں کے مانند یکسو ہو جائیں گے ــــــ مرحوم نے چار لڑکے اور ایک بچی اپنی نشانی کے طور پر چھوڑی ہے ــــــ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور ان بچوں کو ان کے لئے صدقۂ جاریہ بنا دے! آمین!

محمد حمید احمد مرحوم کی کل عمر ۴۲ برس تھی، گویا وہ ابھی جوانی بھی نہیں نوجوانی کے عالم میں تھے اور ان کے بارے میں تو یہ شعر صد فی صد درست ہے کہ ؎

پھول تو دو دن بہارِ جانفزا دکھلا گئے ۔۔۔ حسرت تو اُن غنچوں پہ ہے جو بِن کھلے مرجھا گئے

بی ایس سی سے فارغ ہوتے ہی وہ اپنے والد اور بڑے بھائی کے ساتھ کاروبار میں بھرپور طور پر شریک ہو گئے تھے اور اپنے کاروباری حلقے میں اپنی ہنس مکھ طبیعت اور شگفتہ مزاجی کی بنا پر حد درجہ ہر دلعزیز تھے۔ میرے ساتھ مرحوم کا تعلق محض بھتیجے اور دامادی کا نہیں اس سے بھی بڑھ کر تنظیم اسلامی کی رفاقت اور سب سے زیادہ یہ تھا کہ انہوں نے کمال ذوق و شوق اور پوری پابندی اور مستقل مزاجی کے ساتھ قرآن اکیڈمی کا دو سالہ کورس مکمل کیا اور آخری امتحان میں امتیازی شان کے ساتھ کامیابی حاصل کی۔ اور اب ہم نے اس کورس میں نمایاں کامیابی حاصل کرنیوالوں کی مزید تعلیم و تربیت کے لئے جو شام کی کلاسز جاری کی ہیں وہ ان میں بھی شرکت کر رہے تھے ــــــ اور مجھے امیدِ واثق تھی کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے میرے دو بیٹوں کو میرے مشن میں میرا دست و بازو بنا دیا ہے اسی طرح برادرم اقتدار احمد کی اولاد میں سے آنعزیز دین کے ہمہ وقت اور ہمہ تن خدمت کے لئے وقف ہو جائیں گے ــــــ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس گُلِ نوشگفتہ کو الفاظِ قرانی " تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا " کے مصداق فوری طور پر اپنے جوارِ رحمت میں طلب فرما لیا۔ اور یہ بھی ہم پر اسیّٰ کا فضل و کرم ہے کہ ہم حضرت علیؓ کے اس مصرعے کے مصداق کہ رَضِينَا قِسْمَةَ الْجَبَّارِ فِينَا اسکی رضا پر راضی ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ برادرِ عزیز اقتدار احمد اور ان کی اہلیہ نے اس حادثہ فاجعہ کو جس ہمت و استقامت کے ساتھ برداشت کیا اور صبر و تسلیم اور راضی برضا رب رہنے کی جو مثال قائم کی وہ بیان سے باہر ہے۔ ان کے گھر سے بیک وقت ایک کڑیل جوان داماد اور

ایک نوجوان و ہونہار بیٹے کی لاشیں نکلیں جس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں لیکن یہ ایمان و توکل اور تسلیم و رضا کا ادنیٰ کرشمہ ہے کہ مردوں کی تو کیا خواتین کی آواز بھی بلند نہ ہوئی اور بالکل وہ نقشہ نگاہوں کے سامنے آگیا جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظ مبارکہ میں وارد ہوا ہے کہ "اِنَّ الْعَیْنَ تَدْمَعُ وَالْقَلْبَ یَحْزَنُ وَلَا نَقُوْلُ اِلَّا مَا یُرْضِی رَبَّنَا" یعنی آنکھ آنسو بہاتی ہے اور دل غمگین ہے لیکن ہم کہتے وہی ہیں جو ہمارے رب کو پسند ہے۔"

بندۂ مومن کی حادثاتی موت کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت سے تعبیر فرمایا ہے۔ بنا بریں بلاشبہ یہ دونوں مرحومین شہیدوں میں شامل ہیں۔ البتہ حمید احمد مرحوم جس جذبہ اور مستقل مزاجی کے ساتھ دین کی خدمت کے لئے پیش قدمی کر رہے تھے اس کے پیش نظر ان کی شہادت تو درجہ کے اعتبار سے بھی بہت بلند ہے۔ یہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نوید کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ:

"من جاءہ الموت وھو یطلب العلم لیحیی بہ الاسلام فبینہ وبین النبیین درجۃ واحدۃ فی الجنۃ" (مشکوٰۃ کتاب الایمان، باب العلم، فصل سوم)	"جس شخص کو اس حال میں موت آئی کہ وہ اسلام کو زندہ کرنے کے ارادے سے علم حاصل کر رہا تھا تو جنت میں اس کے اور انبیاء کے مابین صرف ایک درجہ کا فرق ہوگا۔"

مرحوم حمید احمد نے اپنی یادگار کے طور پر دو پھول چھوڑے ہیں۔ ایک پونے دو سال کی بچی اور ایک بچہ جو اب سوا پانچ ماہ کا ہوا ہے ـــــ عجیب بات یہ ہے کہ یہ بچہ اس سال ۱۴ مئی کو پیدا ہوا تھا ـــــ اور اسی روز ہم نے شہدار بالاکوٹ کی یاد میں ایک جلسہ جناح ہال لاہور میں منعقد کیا تھا۔ چنانچہ اسی مناسبت سے راقم نے اس کا نام سید احمد شہید کے نام پر سید احمد رکھا۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ اس بچے کو قتال فی سبیل اللہ والی اعلیٰ ترین شہادت عطا فرمائے ع " شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا "

اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے ـــــ انہیں اعلیٰ علیین میں داخل فرمائے اور ان کے بچوں کو جملہ پس ماندگان بالخصوص دادا دادی کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنائے رکھے آمین یارب العلمین!!

مرحومین کی نمازِ جنازہ میں لگ بھگ ڈیڑھ ہزار اشخاص نے شرکت کی، جن میں امیرِ جماعتِ اسلامی میاں طفیل محمد مرکزِ جماعت کے تقریباً تمام عہدیداروں کے ساتھ شامل تھے۔ علماءِ کرام میں سے مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا محمد مالک کاندھلوی ایسے بزرگ علماء کے ساتھ ساتھ مولانا سعید الرحمٰن علوی، قاری عبدالقیوم اور قاری سعید الرحمٰن سمیت کثیر تعداد میں نوجوان علماء نے شرکت فرمائی۔ صحافی حضرات میں اردو ڈائجسٹ کے جملہ قریشی برادران (جو رشتے میں ہمارے چچا ہیں) کے علاوہ میاں محمد شفیع، محبوب الرحمٰن شامی اور جناب مصطفیٰ صادق کے نام یاد رہ گئے ہیں، معروف دانشوروں میں سے پروفیسر مرزا محمد منوّر کے علاوہ پروفیسر سی اے قادر، ڈاکٹر عبدالخالق (شعبۂ فلسفہ جامعہ پنجاب) اور پروفیسر وارث میر کے نام قابلِ ذکر ہیں ——— راقم الحروف ان حضرات کے ساتھ ساتھ ان ڈیڑھ ہزار کے لگ بھگ اعزّہ و اقارب، رفقاء و احباب اور مرحومین کے کاروباری وابستگان و متعلقان کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہے جنہوں نے نمازِ جنازہ میں شرکت فرمائی۔ اس لئے کہ ہمارے دین میں فوتیدگی کے ضمن میں اجتماعی تقریب صرف یہی ایک ہے، باقی سب بعد کے اضافے ہیں جن سے اللہ تعالےٰ نے ہمیں اپنے فضل و کرم سے بچا لیا ہے ——— بالعموم دیکھنے میں آتا ہے کہ نمازِ جنازہ میں شریک ہونے والوں کی اکثریت نماز کے فوراً بعد منتشر ہو جاتی ہے اور تدفین اور اس کے بعد کی دعا میں صرف قریبی اعزّہ ہی شریک ہوتے ہیں لیکن مرحومین کی تدفین کے آخر تک جو انبوہِ کثیر موجود رہا اور تدفین کے بعد کی دعا میں جتنے لوگوں نے شرکت فرمائی اس سے بھی شرکاء کے گہرے تاثر اور شدید دل گیری کا اندازہ ہوتا ہے۔ فجزاھم اللہ عنّا احسن الجزاء۔

تدفین (۲۸ ستمبر) کے بعد سے ان سطور کی تحریر (۱۹ اکتوبر) تک تعزیت کے لئے ہر شعبۂ زندگی اور ہر طبقے اور سطح کے لوگ جس کثیر تعداد میں تشریف لائے اس سے اس عربی شعر کی صداقت و حقّانیت کے باوجود کہ ؎

يُعَزُّوْنَ عَنْكَ وَاَيْنَ الْعَزَاءُ
وَ لٰكِنَّهٗ عَمَلٌ مستحب!

یقیناً ہمارا دکھ بٹا، اور ہمارے رنج و غم میں کمی ہوئی۔ راقم ان جملہ حضرات کا بھی شکریہ ادا کرتا ہے اور ان میں سے بالخصوص ان حضرات سے شکریہ کے ساتھ ساتھ معذرت خواہ بھی ہے جو

قرآن اکیڈمی تشریف لائے لیکن اس بنا پر مجھ سے ملاقات نہ ہو سکی کہ میں اکثر و بیشتر برادرِ عزیز اقتدار احمد کے مکان پر ہوتا تھا۔

اندرون و بیرونِ ملک سے ٹیلیفون کے ذریعے جن حضرات نے تعزیت فرمائی ان کا تو نہ شمار ہے نہ ریکارڈ۔ مزید برآں ان کا شکریہ بھی فوری طور پر "بالمکالمہ" ادا ہو گیا تھا۔ البتہ تاروں اور خطوط کے ضخیم فائل بن گئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نے ہمارے زخمی دلوں کے لئے مرہم کا کام کیا۔ بعض خطوط علم و ادب کے شہپاروں کی حیثیت رکھتے ہیں، ان شاء اللہ ان میں سے چند ایک ہدیۂ قارئین بھی کئے جائیں گے ـــــ البتہ ان جملہ مکتوب نگار حضرات کا شکریہ بس اسی تحریر کے ذریعے حاضرِ خدمت ہے، راقم قلم کا ویسے بھی دھنی نہیں، خطوط نویسی میں تو بہت کمزور ہے ـــــ چنانچہ ان سینکڑوں خطوط کا جواب اس کے لئے محالِ مطلق ہے ـــــ امید ہے کہ میری ان کمزوریوں کے پیشِ نظر میرے بزرگ رفقاء و احباب میری معذرت قبول فرمائیں گے، ـــــ "وَالعذرُ عِندَ کِرامِ النّاسِ مقبولُ"! ـــــ اگر اس اشاعت میں گنجائش نکل تو ان جملہ مکتوب نگار حضرات کے نام شائع کر دیئے جائیں گے تاکہ انہیں کم از کم اپنے خطوط کی رسید مل جائے ۔!!!

آج کل کا عام مشاہدہ یہ ہے کہ جدید طرز کے دینی مفکّر و دانشور اور داعی و مبلّغ تو اکثر و بیشتر اس نعمتِ عظمٰی سے محرومِ محض ہیں ہی، قدیم طرز کے علمائے راسخین کے حلقوں میں بھی اب اس کی مثالیں کم ہی نظر آتی ہیں کہ ان اولادیں اور قریبی رشتہ دار بھی ان ہی کے نقشِ قدم پر گامزن اور ان کے مشن میں عملاً شریک ہوں ـــــ تو اگرچہ راقم الحروف اصلاً تو مقدّم الذّکر حلقے سے تعلق رکھتا ہے تاہم مؤخر الذکر طبقے سے اسے جو انس و محبت ہے

أُحِبُّ الصَّالِحِينَ وَلَسْتُ مِنْهُمْ ۔۔۔ لَعَلَّ اللهَ يَرْزُقُنِي صَلَاحًا

کے مصداق حاصل ہے، غالباً یہ اسی کا ثمرہ ہے کہ اس کی اولاد بھی کُل کی کُل اس کے مشن میں شریک ہے اور بھائیوں کی اکثریت اور قریب ترین اعزّہ کی بڑی تعداد بھی اس کے معاونین میں شامل ہے ـــــ چنانچہ اللہ نے چار بیٹے عنایت فرمائے تو ان میں سے دو تو تنظیم اسلامی اور قرآن اکیڈمی دونوں کے "رفقاء" کی حیثیت سے ہمہ وقت اور ہمہ تن شریک کار ہیں ہی، تیسرا اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں اسلامی معاشیات کا طالب علم اور تنظیم اسلامی میں شامل ہے۔ چوتھا بھی چھوٹا

ہے اور ہائی سکول کا طالب علم ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان دونوں کو بھی ہمہ تن اور ہمہ وقت دین کی خدمت کے لئے قبول فرمالے ——— اسی طرح میری پانچوں بیٹیاں اور تمام داماد بھی بفضلہٖ تعالیٰ تنظیم میں شامل اور میرے مشن میں عملاً شریک ہیں۔ بچّوں اور بچّیوں کی اس کیفیت میں ظاہر ہے کہ زیادہ عمل دخل میری اہلیہ کے رجحانِ طبع اور محنت و کوشش کو حاصل ہے اور اللہ کا بڑا فضل ہے کہ وہ میری صرف رفیقۂ حیات ہی نہیں رفیقۂ کار بھی ہیں، اولاد کے علاوہ ان کے ایک بھائی اور ایک بھتیجے بھی تنظیم اسلامی میں شامل ہیں۔ خود میرے حقیقی چچازاد بھائی ایک ہی ہیں اور بحمداللہ وہ بھی میرے شریکِ کار ہیں!

راقم کے حقیقی بھائی چار ہیں، الحمدللہ کہ ان میں سے بھی تین راقم سے باقاعدہ بیعت اور تنظیم میں باضابطہ شامل ہیں۔ ان میں سے برادرم اقتدار احمد کا معاملہ اس اعتبار سے منفرد ہے کہ ایک جانب بالکل میرے اہل و عیال کے مانند ان کی بھی رفیقۂ حیات اور تمام بالغ بچے اور بچّیاں تنظیم میں شامل ہیں اور دوسری جانب وہ خود بھی اپنی تمام تر کاروباری مصروفیات کے باوصف انجمن خدّام القرآن اور تنظیم اسلامی کے کاموں میں فعّال طریقہ پر حصّہ لے رہے ہیں۔ چنانچہ وہ مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور کی مجلسِ منتظمہ کے منتخب رکن بھی ہیں اور یکے ازاعزازی ناظمین بھی (ناظم مکتبہ ونشر و اشاعت) اور اس کے ساتھ ساتھ تنظیم اسلامی کی مرکزی مجلسِ شوریٰ کے منتخب رکن بھی ہیں اور تنظیم کے فعّال کارکن بھی۔ گویا ان کی ذات میں مجھے بلاتشبیہ حضرت موسیٰؑ کی اس دعا کا عکسِ کامل نظر آتا ہے جو انہوں نے اپنے بھائی حضرت ہارونؑ کے لئے کی تھی یعنی :

وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ۝ هٰرُوْنَ اَخِي اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ۝
وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ۝ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ۝
وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ۝ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ۝

ایک نوجوان بیٹے اور ایک جوان داماد کی اچانک موت کی صورت میں وہ جس جانکاہ صدمے سے دوچار ہوئے ہیں اس کے نتیجے میں، اور چونکہ وہ دونوں ان کے کاروبار میں بھی عملاً شریک تھے اور خصوصاً عبداللہ طاہر سیال مرحوم کو تو ان کے کاروبار کے اہم ستون کی حیثیت حاصل تھی لہٰذا اس میدان میں بھی جو فوری خلا پیدا ہوا ہے اس کے پیشِ نظر راقم کا خیال تھا کہ اب برادرِ عزیز اقتدار احمد تحریکی اور تنظیمی کاموں کے لئے کم وقت دے سکیں

گے ـــــ لیکن الحمدللہ کہ انہوں نے اس ضمن میں نہ صرف اپنی سابقہ ذمّہ داریوں کو برقرار رکھنے کا عزم کیا ہے بلکہ رفیقِ مکرّم شیخ جمیل الرّحمٰن صاحب کی کراچی واپسی سے جو خلا 'میثاق' اور 'حکمتِ قرآن' کے ضمن میں پیدا ہوا ہے اسے بھی پورا کرنے کی اضافی ذمّہ داری سنبھال لی ہے۔ چنانچہ آئندہ سے وہ ان دونوں ماہناموں کے 'مینجنگ ایڈیٹر' کی ذمّہ داری بھی سنبھالیں گے ـــــ اس ساری بات اور اس طویل تمہید کا اصل مقصد یہ ہے کہ قارئین کرام ان کے لئے خصوصی دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کو ہمت اور استقامت عطا فرمائے ـــــ اور انکے کاروباری معاملات میں جو خلا ان اچانک اموات سے پیدا ہوا ہے اسے اپنے خصوصی فضل وکرم سے پُر فرما دے ـــــ تاکہ وہ خدمتِ دین کے ضمن میں اپنی ذمّہ داریوں کو یکسوئی اور طمانیتِ قلب کے ساتھ کما حقہٗ پورا کر سکیں۔

خیال آیا کہ اگرچہ ذاتی امور پر گفتگو طویل ہو گئی ہے تاہم اتنا اور عرض کر ہی دیا جائے کہ ہم سب بھائیوں اور ہماری اولاد کو جو بھی توفیق خدمتِ دین کی نصیب ہوئی ہے اس میں اہم ترین حصّہ ہماری والدہ صاحبہ مکرمہ کی تعلیم وتربیت اور ان کی نیک آرزوؤں اور دعاؤں کا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کا سایہ ہمارے سروں پر تا دیر سلامت رکھے، ہم سب بھائیوں کی جانب سے ان کی خدمت کا فرض کفایہ برادرِ عزیز وقار احمد سلمہٗ بحسن وخوبی ادا کر رہے ہیں۔ فجزاہُ اللہُ عنّا خیر الجزاء ـــــ راقم کو یہ عرض کرتے ہوئے حجاب محسوس ہوتا ہے کہ آج سے چار پانچ سال قبل سنّتِ بیعت کی سعادت حاصل کرنے کے لئے والدہ صاحبہ نے بھی تنظیم اسلامی میں شمولیت اختیار کر لی تھی!

راقم نے اس سال بیرونِ پاکستان سفر ایک تو ڈنمارک، سویڈن اور ناروے کا کیا تھا جو صرف دس روز پر محیط تھا اور جس کی روداد اور اس کے ضمن میں میرے تأثرات قارئین تک پہنچ چکے ہیں ـــــ دوسرا بیرونی سفر ۱۲ جولائی تا ۲۳ اگست بیالیس دنوں پر پھیلا ہوا تھا جس میں سے دو شب و روز اگر خالص سفر کے منہا کر دیئے جائیں تو بقیّہ چالیس دنوں کی تقسیم یوں ہے: ابوظبی اور دوبئی دو دن، حجازِ مقدّس تیرہ دن اور شمالی امریکہ ۲۵ دن ـــــ اس طرح یہ راقم الحروف کا مختصر ترین سفرِ امریکہ تھا! اس لئے کہ اس سے قبل کے ساتوں سفر کم وبیش ایک "چلّہ" پر مشتمل ہوتے تھے۔

گذشتہ سال میں نے اپنے بیرونی سفر کا کوٹہ حجاز و نجد کے علاوہ ابوظبی و دوبئی اور دہلی و حیدرآباد (دکن) کے لئے مختص کر دیا تھا اور شمالی امریکہ کے احباب سے معذرت کر لی تھی بلکہ ۸۴ء میں ان پر یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ میرے پاس جو کچھ ہے وہ میں آپ حضرات کو دے چکا ہوں، اور میری 'دعوتِ قرآنی' اب 'تمام و کمال' آپ حضرات کے پاس کیسٹوں کی شکل میں موجود ہے۔ لہٰذا اب میری ہر سال کی آمد محض ایک رسم اور تکلف محسوس ہوتی ہے۔ اب اس اسلامی انقلاب کی دعوت کی توسیع ـــــ اور اس کی اساس پر تحریک برپا کرنا اصلاً آپ لوگوں کی ذمہ داری ہے ـــــ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ میری یہ نصیحت صرف ایک سال کے لئے مؤثر رہی اور اس سال پھر فرمائش کی شدت ہو گئی۔ ادھر میری اس کمزوری سے احباب خوب واقف ہیں کہ رفقاء کی فرمائش کی نفی ـــــ اور بالخصوص ان کے اصرار پر انکار میرے لئے محال ہے! لہٰذا برادرم قمر سعید قریشی صاحب کی معیت میں یہ سفر ہوا جس کی مختصر روداد گذشتہ شمارے میں شائع ہو چکی ہے۔

اس وقت اس کے صرف ایک اہم پہلو کا ذکر مطلوب ہے اور وہ یہ کہ الحمد للہ کہ اس سفر کے دوران جو دو تربیتی کیمپ شمالی امریکہ میں منعقد ہوئے یعنی ایک تنظیم اسلامی کے زیر اہتمام کینیڈا میں (ٹورنٹو اور مانٹریال کے درمیان ایک گھنے جنگل میں واقع لائنگ لیک کیمپنگ سائٹ پر) اور دوسرا انجمن خدام القرآن شکاگو کے زیر اہتمام انڈیانا پولیس کے قریب پلین فیلڈ میں واقع اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ (ISNA) کے مرکز میں، ـــــ ان میں قرآن حکیم کی اس بنیادی انقلابی دعوت، پر مشتمل جو لاتعداد کیسٹس کی صورت میں پہلے ہی مسلمانانِ امریکہ کے وسیع حلقوں میں پہنچ چکی ہے ـــــ ایک جانب تحریکی و تنظیمی مسائل کے ضمن میں مطالعہ قرآن کا جو منتخب نصاب ۴۲ مرتب ہوا ہے اس کے اکثر حصوں کے دروس اور ـــــ دوسری جانب سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ کردہ انقلابِ اسلامی کے منہج و طریق اور مدارج و مراحل کی تفاصیل پر مشتمل تقاریر بھی نہ صرف آڈیو (AUDIO) بلکہ ویڈیو (VIDEO) کیسٹس (CASSETTES) کی صورت میں محفوظ ہو گئی ہیں۔ ان میں سے اوّل الذکر اردو میں ہیں اور مؤخر الذکر انگریزی میں۔ اس لئے کہ ان میں ISNA کے بعض ایسے عہدیدار بھی شریک تھے جن کا تعلق مختلف عرب ممالک سے ہے ـــــ اس طرح اب اصلاً قرآن حکیم اور تبعاً سنتِ رسولؐ پر

مبنی ایک اسلامی انقلابی تحریک کے لئے تمام ضروری مواد امریکہ پہنچ چکا ہے اور اب یہ وہاں کے رفقاء کا کام ہے کہ خود اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر اس دعوت کو پھیلائیں ــــــ اور اس کی اساس پر اقامتِ دین کی تحریک برپا کرنے کی کوشش کریں اس لئے کہ کچھ معلوم نہیں کہ شاید اللہ تعالیٰ موجودہ پوری امتِ مسلمہ کو رد کر کے "یَسْتَبْدِلْ قَوْماً غَیرَکُم ولاتضرّوہ شیئًا" کے مصداق کسی غیر مسلم قوم کو توفیق ہدایت دے کر اپنا دین کا جھنڈا اٹھا دے۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز

ان سطور سے اصل مقصود یہ ہے کہ انجمن خدام القرآن اور تنظیم اسلامی کے امریکی رفقاء و احباب آئندہ راقم کو سفرِ امریکہ سے معذور سمجھیں تاکہ راقم اب اپنے تمام اوقات کو پاکستان ہی میں اسلامی انقلاب کی تمہید کے لئے صرف کر سکے۔

اس ضمن میں ایک بات اور بھی قابلِ ذکر ہے ــــــ اور وہ یہ کہ جیسے کہ راقم نے بارہا عرض کیا ہے راقم امریکہ کے سفر کے ضمن میں بائبل کے الفاظ میں "کھوئی ہوئی بھیڑوں کی تلاش" کو بھی پیشِ نظر رکھتا تھا یعنی ان تعلیمیافتہ اور ذہین و باصلاحیت لوگوں کو پاکستان واپس آنے پر آمادہ کرنا جو اوّلاً حصولِ تعلیم کے لئے بیرونِ ملک گئے تھے لیکن بعدازاں بہتر معاش کی تلاش میں امریکہ اور دیگر مغربی ممالک میں آباد ہو گئے ہیں اور ان میں ایک معتدبہ تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جو دینی جذبے سے سرشار ہیں اور مختلف النّوع دعوتی و تبلیغی اور تعلیمی و تدریسی سلسلوں سے منسلک ہیں! گویا بقول اقبال ؎

"میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو!"

لیکن آٹھ سال کے تجربے سے یہ واضح ہوا کہ اوّل تو ان لوگوں کی اکثریت کو مراجعت وطن پر آمادہ کرنا ہی محال ہے، اس لئے کہ اقبال کے قول کے مطابق "ہم مشرق کے مسکینوں کا دل مغرب میں جا اٹکا ہے ــــ واں کنٹر سب بلوری ہیں، یاں ایک پرانا مٹکا ہے!"[1] ثانیاً

---

[1] اس کے ضمن میں ایک بہت ہی دلچسپ اور عبرت آمیز بات ہے جو بالٹی مور میں آباد ایک ماہر امراض چشم ڈاکٹر صاحب نے اب سے تین چار سال قبل راقم سے کہی تھی کہ "ڈاکٹر صاحب! یہ امریکی افریقہ کے سیاہ فام لوگوں کو تو لوہے کی زنجیروں میں باندھ کر یہاں لائے تھے ــــ اور ہمیں انہوں نے یہاں سنہری زنجیروں میں جکڑ دیا ہے!" راقم کو اچھی طرح یاد ہے کہ یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

جو لوگ ہمت کر کے وطن واپس آجاتے ہیں متعدد مثالیں اس کی موجود ہیں کہ وہ لاکھ کوشش کے باوجود ـــــ اور شدید مالی نقصانات کے علی الرّغم یہاں کے اس دفتری اور کاروباری ماحول کے ساتھ کسی طرح سازگاری اختیار نہ کر سکے جس میں قدم قدم پر رشوت اور سفارش ہی نہیں دھوکا اور فریب، جانبداری اور کنبہ پروری ـــــ اور ان سب پر مستزاد ایک دوسرے کی ٹانگیں گھسیٹنے اور پیٹھ پیچھے برائی کرنے کا جال بچھا ہوا ہے! لہٰذا انہیں بصد حسرت و یاس دوبارہ وطنِ عزیز کو خیر باد کہتے ہی بنی!

بنا بریں یہی بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اب امریکی احباب کو ان کے حال پر چھوڑ کر اور اُن کے ضمن میں دعاگوئی اور دُور سے مشورہ در ہنمائی پر اکتفا کرتے ہوئے اپنی توجہات کو تمام تر پاکستان ہی پر صرف کیا جائے کہ اولاً بقول "ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی!" اور ثانیاً ہم پر اصل ذمّہ داری یہیں کی ہے!

البتّہ سعودی عرب اور متحدہ امارات کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ وہاں کسی کو شہریت ملنے کا کوئی سوال نہیں ـــــ لہٰذا وہاں جو لوگ بغرضِ ملازمت یا کاروبار گئے ہوئے ہیں انہیں لازماً وطن واپس آنا ہے ـــــ جلد نہیں تو ذرا دیر سے!! ـــــ لہٰذا ان سے قریبی ربط و تعلق اور ان پر براہِ راست محنت ان شاء اللہ خود پاکستان میں اسلامی انقلاب کی جدّوجہد کے لئے مفید اور بار آور ثابت ہو گی۔

امریکہ کی طرح الحمد للہ کہ گذشتہ کئی سال سے عمرہ کے لئے حرمین شریفین کی حاضری اور دعوتی و تنظیمی مقاصد کے تحت سعودی عرب کے دوسرے مقامات کا سالانہ سفر بھی معمول بن چکا ہے، البتّہ حج کی سعادت آخری بار ۱۹۷۹ء میں امریکہ کے پہلے سفر سے واپسی کے دوران حاصل ہوئی[1] تھی اور گذشتہ دو تین سال سے اس کی پیاس شدّت سے محسوس ہو رہی تھی۔ دو سال قبل

---

[1] یاد ش بخیر، راقم الحروف کو زندگی میں پہلی بار حج کی سعادت والدِ مرحوم و مغفور اور والدہ صاحبہ مدّظلہا کے ساتھ ۱۹۶۲ء میں حاصل ہوئی تھی۔ اس کی یاد اس وقت اس لئے تازہ ہو گئی کہ عزیزم محمد حمید احمد مرحوم کی ولادت کی خبر ہمیں مکّہ مکرّمہ ہی میں موصول ہوئی تھی ـــــ آج ایسے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کل ہی کی بات تھی "كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا عَشِيَّةً أَوْ ضُحَاهَا" (النّٰزعٰت)

ایک صورت حج بدل کی بن بھی گئی تھی لیکن قرعہ میں نام نہ نکلا۔ اور دل کی حسرت دل ہی میں رہ گئی ـــــ اس سال اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے امریکہ کا سفر پھر ایسے دنوں میں طے ہوا کہ واپسی پر حج کی سعادت کا حصول ممکن ہوگیا۔

اپنے دل میں تو میں یہ ارادہ لے کر گیا تھا کہ حج کے بعد حرمین میں سے کسی مقام پر، جہاں بھی اللہ تعالیٰ مناسب انتظام کرا دے، قیام کر کے اپنی تالیف 'استحکام پاکستان' کا دوسرا حصہ بعنوان 'پاکستان میں اسلامی انقلاب: کیا؟ کیوں؟ اور کیسے؟' جس کا وعدہ پہلی کتاب کے آخر میں کیا تھا سپردِ قلم کر دوں ـــــ لیکن 'مَاشَاءَ اللّٰہُ کَانَ وَمَا لَمْ یَشَاءْ لَمْ یَکُنْ!' مناسک حج سے فراغت ہوئی ہی تھی اور منیٰ سے واپسی کے لئے رختِ سفر باندھا ہی تھا کہ راقم کو ایکدم شدید تیز بخار ہوگیا۔ یہ بخار اوّلاً تو بغیر کپکپی کے ایسے چڑھا تھا جیسے گرمی کی شدّت سے مغلوبیت (HEAT STROKE) کا ٹمپریچر بڑھتا ہے لیکن بعد میں وقفہ وقفہ سے جب بھی دافع بخار ادویات کے زیرِ اثر کچھ کم ہوتا تھا پھر شدید کپکپی کے ساتھ تیز ہو جاتا تھا ـــــ چنانچہ مسلسل پانچ دن تک بخار ۱۰۵ اور ۱۰۶ درجے کے آس پاس رہا۔ نتیجۃً وہاں مزید قیام کا خیال ترک کر کے واپسی اختیار کرنی پڑی۔

ـــــ ۲۱ اگست کی سہ پہر کو جب جدّہ ائرپورٹ کے لئے روانگی ہوئی تب بھی بخار ۱۰۴ درجہ تھا ـــــ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حکمتِ خداوندی اور مشیّتِ ایزدی میں جلد واپسی ہی مقدّر تھی کہ جدّہ ائرپورٹ ہی سے بخار ہلکا ہونا شروع ہوگیا ـــــ اور لاہور پہنچنے تک صرف معمولی حرارت باقی رہ گئی۔ تاہم یہ ہلکی حرارت لگ بھگ تین ہفتے جاری رہی اور نقاہت کے رفع ہونے میں مزید دو ہفتے لگ گئے۔! اگرچہ راقم نے اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق سے اپنے معمولات کا آغاز جمعہ ۲۹ اگست سے کر دیا تھا۔ یہانتک کہ ۶ اور ۷ ستمبر کو راولپنڈی اور اسلام آباد کا خاصا بھاری پروگرام بھی پورا ہوگیا۔

۱۲ تا ۱۴ ستمبر تنظیم اسلامی کی مرکزی شوریٰ کا اجلاس تھا۔ ابھی اس کی کارروائی جاری ہی تھی کہ لاہور میں اہلِ تشیّع کی جانب سے میرے خلاف شورش شروع ہوگئی ـــــ جس کا اجمالی تذکرہ گذشتہ اشاعت میں ہو چکا ہے ـــــ تفصیل نہ ضروری ہے نہ مفید بلکہ ایسی باتوں کا بھلا دینا ہی مناسب ہے کہ ؎

"یادِ ماضی عذاب ہے یارب چھین لے مجھ سے حافظہ میرا!"

اللہ کا شکر ہے کہ راقم الحروف کا واقعی احساس ان دنوں یہ رہا کہ چند ایک شریر افراد و اشخاص کو چھوڑ کر جن لوگوں نے نازیبا حرکتیں کیں ان کی غالب اکثریت " اَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ" کے مصداق بالکل ناواقف اور غافل و بے خبر لوگوں پر مشتمل تھی جو محض سُنی سنائی باتوں پر مشتعل ہو گئے تھے۔ اس بنا پر میرے دل کی گہرائیوں سے وہ مسنون دعا ہی نکلتی رہی جس کا آخری ٹکڑا اوپر درج ہوا یعنی " اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِيْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ!" غالب کے اس شعر کے مصداق کہ ؎

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز　　پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا !!

ابھی یہ ہنگامہ پوری شدت سے جاری تھا کہ اُس حادثۂ فاجعہ کی قیامت ٹوٹ پڑی جس کا تفصیلی ذکر ہو چکا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خود اپنی ذاتی خواہش اور ارادے کی شدت اور بعض اہم حلقوں اور شخصیتوں کی جانب سے شدید تقاضے کے باوجود[1] 'استحکامِ پاکستان' کے دوسرے حصے کے لئے قلم نہیں اٹھ سکا۔ اور بحالاتِ موجودہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ پاکستان اور بالخصوص لاہور میں رہتے ہوئے شاید یہ کام مستقبل قریب میں بھی نہ ہو پائے ——— لہٰذا چار و ناچار علامہ اقبال مرحوم کے ان اشعار کے مطابق کہ :

باایں پیری رہ یثرب گرفتم　　نوا خواں از سرورِ عاشقانہ
چوں آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام　　کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ !

دوبارہ حرمین شریفین کا قصد کر لیا ہے ! ——— العزم منّا والاتمام من اللّٰہ !!

اس بار عرفات میں اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل و کرم رہا ——— اور انبساطِ قلب اور انشراحِ صدر کی کیفیات حاصل رہیں، اسی سے یہ امید بھی قائم ہوئی کہ ملک نصر اللہ خاں عزیز مرحوم کے اس شعر کے مصداق کہ ؎

روزہ میرے کریم نے فرما لیا قبول !　　اب چاہے چاند ہو کہ نہ ہو عید ہو گئی

---

[1] واضح رہے کہ 'استحکامِ پاکستان' کل ساڑھے سات ہزار کے لگ بھگ شائع ہوئی تھی اور اس میں سے چھ ہزار نسخے لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ کر قارئین کرام میں گردش کر رہے ہیں۔

میری تمام کوتاہیوں اور فروگذاشتوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے حج قبول فرمالیا۔ ؎

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را!

عرفات کے ان ہی لمحات میں اپنے آباء و امہات، اعزہ و اقارب، اہل و عیال اور دوسرے بزرگوں اور محسنوں کے ساتھ ساتھ اولاً مولانا مودودی مرحوم و مغفور بھی یاد آئے چنانچہ ان کے لیے صمیمِ قلب سے دعا ہوئی ــــــ پھر مولانا امین احسن اصلاحی یاد آئے ــــــ اور ان کے لیے دعا کے ساتھ ساتھ یہ ارادہ بھی دل کی گہرائیوں سے ابھرا کہ پاکستان واپسی پر ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے تمام تر اختلاف رائے کے باوصف کم از کم 'تجدیدِ ملاقات' کر لی جائے ــــــ اختلاف رائے کے ضمن میں یہ عرض کرنے میں بھی کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا کہ ان کے لیے دوسری دعاؤں کے ساتھ ساتھ یہ دعا بھی قلب کی گہرائی سے نکلی کہ اللہ تعالیٰ ان کے دل کو پھیر دے اور 'حدِ رجم' کے ضمن میں اجماعِ امت کے خلاف جو رائے انہوں نے قائم کی ہے انہیں اس سے رجوع کی توفیق عطا فرما دے "فانّ قُلُوبَ جَمِیعَ النَّاسِ بَینَ اِ الرَّحمٰن یُصَرِّفُھَا کَیفَ یَشَاءُ!" ــــــ اور بقول مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ ــــــ "اصل تبدیلی تو دل کی ہوتی ہے۔ دماغ تو کرائے کا وکیل ہے جس جانب دل کا رجحان ہو جائے اسی جانب کے دلائل فراہم کر دیتا ہے۔!"

بہرحال، پاکستان واپسی پر علالت کی نقاہت کے باعث اس ارادۂ ملاقات میں تاخیر ہوئی اور ایسے محسوس ہوا کہ غالباً پاکستان کی فضا میں اختلاف اور تشتت و انتشار کے جو اثرات چھائے ہوئے ہیں ان کے زیرِ اثر ارادہ کچھ مضمحل سا ہوتا معلوم ہو رہا ہے تو اسی شدید نقاہت کے عالم میں ان کے دروازے پر حاضر ہو گیا ــــــ میں گیا تو اس خیال سے تھا کہ یہ بھی عین ممکن ہے کہ مولانا ملنے سے صاف انکار کر دیں اور دروازے ہی سے لوٹا دیں ــــــ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اندر بلا تو لیں لیکن پھر حسبِ عادت خوب اظہارِ غیظ و غضب فرمائیں۔ لیکن معلوم ہوا کہ ؎ "دل را بہ دل رہیست!" والا معاملہ ہے ــــــ اور مولانا کے قلب کی کیفیت بھی بالکل بدل چکی ہے۔ چنانچہ مولانا نے نہ صرف یہ کہ خوش آمدید کہی۔ بلکہ باضابطہ سینے سے لگایا اور بہ کمال لطف و کرم یہ فرمایا کہ:

"تم نے بہت اچھا کیا کہ خود آ گئے ــــــ کچھ دنوں سے میرے دل کی کیفیت بھی یہ ہو چکی ہے کہ میں اب عمر کے جس مرحلے میں ہوں اس کے پیشِ نظر میرا

رجوع کلیتہً اللہ ہی کی جانب ہو جانا چاہیئے اور صرف ایک اختلافِ رائے کے سوا کسی کے لئے کوئی کدورت یا بغض دل میں نہیں رہنا چاہیئے۔"[1]

اس کے بعد، جیسے کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، نہ صرف یہ کہ مولانا مرحومین کے جنازے پر تشریف لائے بلکہ مزید تعزیت کے لئے اپنے خویش کلاں برادرم نعمان علی صاحب کی معیت میں قرآن اکیڈمی بھی تشریف لائے[2] جس کا شکریہ ادا کرنے کے میں نے بارِ دگر مولانا کی خدمت میں حاضری دی۔

مولانا اصلاحی صاحب کے ساتھ اس 'تجدید ملاقات' کی مناسبت سے اس شمارے میں اوّلاً مولانا کی وہ گرانمایہ تحریر شائع کی جا رہی ہے جو جون ۱۹۵۹ء کے 'میثاق' میں 'تذکرہ و تبصرہ' کے زیرِ عنوان شائع ہوئی تھی جس میں 'میثاق الست' اور 'میثاق شریعت' کے حوالے سے ان مقاصد کی وضاحت کی گئی تھی جن کے پیشِ نظر 'میثاق' کا اجراء عمل میں آیا تھا۔ ثانیاً ان کی وہ تاریخی تحریر بھی شائع کی جا رہی ہے جو انہوں نے ۱۹۶۶ء میں 'میثاق' کو راقم الحروف کے حوالے کرتے ہوئے راقم پر اعتماد کے اظہار کے لئے سپردِ قلم فرمائی تھی اور جولائی ۱۹۶۶ء کے پرچے میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میری وہ مختصر تحریر بھی شامل ہے جو اس بھاری ذمہ داری کو سنبھالتے وقت میں نے لکھی تھی۔

راقم الحروف کو اس کا تو برملا اعتراف ہے کہ وہ پرچے کے اس علمی معیار کو ہرگز قائم نہیں رکھ سکا جو مولانا کی ادارت کے دوران قائم ہوا تھا ـــــ اور ظاہر ہے کہ اس کی مجھ ایسے کم علم شخص سے توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی ـــــ البتہ مجھے اس امر کا پورا اطمینان ہے کہ 'میثاق' ان بیس سالوں کے دوران مقدور بھر کوشاں ان ہی مقاصد کے لئے رہا ہے جو مولانا نے اپنی تحریر میں معین کئے تھے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ تادمِ واپسیں ان ہی مقاصد کے لئے جدوجہد کرتے رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

---

[1] واضح رہے کہ اگرچہ یہ روایت بالمعنیٰ ہے نہ کہ باللفظ تاہم ان شاء اللہ اس میں لفظی تغیر بھی کوئی نہ ہوا ہوگا۔ سوائے اس کے کہ مولانا نے 'اچھا' کی جگہ بہت متواضعانہ لفظ استعمال کیا تھا جسے نقل کرنا سوءِ ادب ہے۔ [2] یادش بخیر، آج سے لگ بھگ بارہ سال قبل ۱۲ جنوری ۷۶ء کو مولانا برادرم نعمان علی صاحب ہی کی معیت میں قرآن اکیڈمی کی تعمیر کے آغاز کے موقع پر تقریبِ دعا میں شرکت کے لئے تشریف لائے تھے۔

قندِ مکرر

"میثاق"

(تحریر: ـــــــ مولانا امین احسن اصلاحی)

ماخوذ از "تذکرہ وتبصرہ" میثاق جون ۵۹ء

اس رسالے کا نام "میثاق" محض اتفاق سے نہیں رکھ لیا گیا ہے۔ بلکہ یہ نام سوچ سمجھ کر انتخاب کیا گیا ہے۔ یہ نام بہت بڑی حد تک اس مقصد کو تعبیر کرتا ہے جو اس کے نکالنے سے پیشِ نظر ہے۔

لغت میں میثاق سے مراد وہ عہد و پیمان ہوا کرتا ہے جو شعور اور ارادے کے ساتھ پورا کرنے کیلئے باندھا جائے۔ قرآن و حدیث میں اس کا مفہوم اس سے بہت بلند ہے اور چونکہ وہی مفہوم اس نام میں ہمارے پیشِ نظر ہے اس وجہ سے اس کو سمجھ لینا ضروری ہے۔

قرآن مجید میں اس سے مراد وہ عہد و پیمان ہے جو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ہوا ہے قرآن نے اس قسم کے دو میثاقوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک تو وہ میثاق ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کو اس دنیا میں بھیجنے سے پہلے ان کی عقل و فطرت سے لیا ہے۔ اس میثاق کا ذکر سورہ اعراف میں اس طرح فرمایا ہے۔

و اذ اخذ ربك من بنی ادم من ظهورهم ذریتهم واشهدهم علی انفسهم الست بربكم قالوا بلی شهدنا ان تقولوا یوم القیمة انا كنا عن هذا غافلین ۷۲ - "اعراف"

اور یاد کرو جبکہ نکالا تمہارے رب نے بنی آدم سے یعنی انکی پیٹھوں سے ان کی ذریت کو اور انکو خود انکے اوپر گواہ بنایا، پوچھا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے اقرار کیا کہ ہم گواہ ہیں کہ تو ہمارا رب ہے۔ یہ اس لئے ہوا تاکہ تم قیامت کے دن یہ نہ کہہ سکو کہ ہم تو اس چیز سے بالکل بے خبر ہی رہے۔

یہ خدا کی ربوبیت اور اس کی توحید کا میثاق ہے جو ہر انسان کی فطرت سے لیا گیا ہے اور اس پر ہماری عقل و فطرت گواہ ہے۔

دوسرا عہد و میثاق وہ ہے ـــــــ جو اسی میثاق فطرت کی بنیاد اور درحقیقت اسی کے تقاضوں اور مطالبات کو بروئے کار لانے کے لئے ہمارے رب نے اپنے نبیوں اور رسولوں کی وساطت سے ہم سے لیا ہے ۔ یہ میثاق حضرت آدم سے لے کر حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تک جتنے پیغمبر اور رسول آئے ہیں سب نے خدا کے نمائندے کی حیثیت سے اپنی اپنی امتوں سے لیا ہے ۔ یہ میثاق اپنی فطرت کے لحاظ سے ہے ایک ہی میثاق لیکن چونکہ اس کی تجدید بار بار اور مختلف زمانوں میں ہوئی ہے اس وجہ سے ظاہر میں اس کے اندر تعدد پیدا ہو گیا ہے ۔ قرآن مجید نے ان تمام میثاقوں کا حوالہ دیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ یہ میثاق اب امت محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) سے لیا جا رہا ہے تو اس امت کے لوگوں کا فرض ہے کہ اس میثاق پر خود بھی قائم رہیں اور دوسروں کو بھی اس کے اندر شامل کرنے اور ان کو اس پر قائم رکھنے کے لئے برابر اس کی شہادت دیتے رہیں ۔ قرآن جو اس میثاق کی آخری اور مکمل دستاویز ہے ، اس حقیقت کی یاددہانی ان الفاظ میں کر رہا ہے ۔

واذکروا نعمۃ اللہ علیکم ومیثاقہ الذی واثقکم بہ ، اذ قلتم سمعنا واطعنا واتقوا اللہ ان اللہ علیم بذات الصدور ۝ (۷ - مائدہ)	اور تم اس فضل کو یاد رکھو جو اللہ نے تم پر فرمایا اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور قبول کیا اور اللہ سے ڈرتے رہو ، بے شک اللہ دلوں کے بھیدوں کو جاننے والا ہے ۔

ایک جگہ فرمایا ہے ۔

وقد اخذ میثاقکم ان کنتم مومنین (۸ - حدید)	اور اللہ نے تم سے میثاق لیا ہے اگر تم مومن ہو ۔

یہی میثاق ہے جو ان تمام حقوق و فرائض کو متعین کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے لئے ہم نے تسلیم کئے ہیں ۔ یہی میثاق ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ اس دنیا میں ہمارے حدود کار کیا ہیں اور اگر ہم ان کے پابند رہیں تو اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ کیا معاملہ کرے گا اور اگر ہم ان کی خلاف ورزی کریں تو اس جرم کی سزا کیا دے گا ۔ یہ عہد و میثاق یکطرفہ نہیں ہے بلکہ ، جیسا کہ ہر عہد و میثاق کی فطرت ہوتی ہے

یہ دو طرفہ ہے۔ اگرچہ تمام کائنات کے خالق و مالک کی شان اس سے ارفع ہے کہ وہ اپنے بندوں اور غلاموں پر اگر کچھ حقوق و فرائض عاید کرے تو اس کے جواب میں خود اپنے اوپر بھی ان کے حقوق عاید کرے اور اس چیز کو ایک معاہدہ اور میثاق کا درجہ دے دے لیکن چونکہ اس نے ہمیں اختیار کی نعمت عطا فرمائی ہے اس وجہ سے اس نے اس عہد و میثاق کو ہمارے اوپر یک طرفہ واجب نہیں کیا ہے بلکہ اپنے فضل و رحمت سے خود اپنے اوپر بھی اس میثاق کی ذمہ داری لی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں صاف الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے۔

اوفوا بعھدی اوف بعھدکم وایای فارھبون۔ (۴۰ - بقرہ)	تم اس عہد کو پورا کرو جو تم نے مجھ سے کیا ہے میں اس عہد کو پورا کروں گا جو میں نے تم سے کیا ہے تو تم مجھ ہی سے ڈرو۔

اسی میثاق پر ہمارے رب کے ساتھ ہمارے تمام تعلقات قائم ہیں۔ اگر ہم اس پر قائم رہیں تو ہم اپنے رب کی وفادار رعیت اور اس کے اطاعت شعار غلام ہیں اور اس کی طرف سے ہمارے لئے فوز و فلاح اور غلبہ و نصرت کا وعدہ ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

ومن اوفی بما عاھد علیہ اللہ فسیوتیہ اجرا عظیما (۱۰ - الفتح)	اور جو ان باتوں کو پورا کرے گا جن کے لئے اُسنے اللہ سے عہد کیا ہے تو اللہ اس کو اجر عظیم عطا فرمائے گا۔

اور اگر ہم اس عہد کو توڑ دیں تو ہم اس کے نافرمان اور باغی ہیں اور اس جرم کی پاداش میں اس کی طرف سے ہمارے لئے لعنت اور دنیا و آخرت دونوں کی رسوائی ہے، ارشاد ہے۔

والذین ینقضون عھد اللہ من بعد میثاقہ ویقطعون ما امر اللہ بہ ان یوصل ویفسدون فی الارض اولئک لھم اللعنۃ ولھم سوء الدار۔ (۲۵ - الرعد)	اور جو لوگ اللہ کے عہد کو مضبوطی کے ساتھ باندھ چکنے کے بعد توڑتے ہیں اور اس چیز کو کاٹتے ہیں جس کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اُن کیلئے لعنت اور بُرا ٹھکانا ہے۔

یہود کے بارے میں فرمایا ہے۔

فبما نقضهم ميثاقهم لعنٰهم وجعلنا قلوبهم قاسية (۱۳ - مائدہ)	بوجہ اس کے انہوں نے میثاق کو توڑا ہم نے ان کے اوپر لعنت کر دی اور ان کے دل سخت کر دیئے

نصاریٰ کے بارے میں فرمایا ہے۔

ومن الذين قالوا انا نصارى اخذنا ميثاقهم فنسوا حظا مما ذكروا به فاغرينا بينهم العداوة والبغضاء الى يوم القيمة (۱۴ - مائدہ)	ان لوگوں سے جنہوں نے کہا ہم نصاریٰ ہیں ہم نے ان کا میثاق لیا تو جس چیز کے ذریعہ سے ان کو یاد دہانی کی گئی تھی اس کا ایک حصہ وہ بھلا بیٹھے تو ہم نے ان کے اندر اس کی پاداش میں قیامت تک کے لئے دشمنی اور نفرت کی آگ بھڑکا دی۔

یہ رسالہ اسی میثاق کی تذکیر و یاد دہانی کے لئے جاری کیا گیا ہے، اور اسی نسبت سے اس کا نام میثاق رکھا گیا ہے۔ جس طرح ہر باوفا اور ہر صداقت شعار کے لئے اس میثاق پر ہر طرح کے حالات کے اندر قائم رہنا ضروری ہے اسی طرح ہر صاحب علم اور ہر صاحب شعور کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دوسروں کو اس عہد و پیمان کی یاد دہانی بھی کرتا رہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں سے اس میثاق پر قائم رہنے کا بھی عہد لیا ہے اور ساتھ ہی دوسروں کو اس سے آگاہ کرنے اور ان پر اس کی حجت تمام کرنے کا بھی عہد لیا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے

واذ اخذنا من النبيين ميثاقهم ومنك ومن نوح وابراهيم وموسى وعيسى بن مريم واخذنا منهم ميثاقا غليظا۔ (۷ - احزاب)	اور یاد کرو، جبکہ ہم نے نبیوں سے میثاق لیا، اور تم سے اور نوح سے، ابراہیم سے، موسیٰ سے اور عیسیٰ بن مریم سے سب سے میثاق لیا اور لیا ہم نے ان سے مضبوط میثاق۔

اسی طرح اہل کتاب کے علماء اور پیشواؤں سے یہ عہد لیا گیا کہ جس کتاب اور شریعت کی پابندی کا انہوں نے اقرار کیا ہے اس پر پوری مضبوطی کے ساتھ خود بھی قائم رہیں اور اس کی دفعات اور اس کے مضمرات دوسروں پر بھی آشکارا کرتے رہیں۔ فرمایا ہے۔

واذاخذ اللہ میثاق الذین اوتوا الکتاب لتبیننہ للناس (۱۸۷۔ آل عمران)

اور یاد کرو جبکہ اللہ نے اہل کتاب سے اس بات کا میثاق لیا کہ تم اس کو اچھی طرح لوگوں کے لئے واضح کرتے رہوگے۔

یہ رسالہ اس فرض عظیم کو بلا امتیاز مذہب عام انسانوں کے اندر بھی ادا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور خاص طور پر مسلمانوں کے اندر بھی اس کو ادا کرنا چاہتا ہے اور ان دونوں دائروں کے اندر ان کے فطری تقاضوں کے لحاظ سے اس کا طریق تذکیر و دعوت کسی قدر الگ الگ ہوگا۔

عام بنی نوع انسان کو یہ خدا کے میثاق ربوبیت کی بنیاد پر دعوت دیگا۔ اس میثاق کے اوپر گواہ جیسا کہ میں نے اشارہ کیا ہے انسان کی عقل و فطرت ہے اس وجہ سے عقل و فطرت اور آفاق و انفس کے اندر اس کی جو شہادتیں موجود ہیں ان کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی جائیگی اور پھر زندگی کے اندر اس کے جو تقاضے ابھرنے چاہئیں ان کی نشان دہی کی جائے گی۔ جدید فلسفہ نے فکر و تحقیق کے ہر گوشے میں اگر ایک طرف حقیقت کو گم کر دینے والی بہت سی مزخرفات کا انبار لگا رکھا ہے تو دوسری طرف اس میں ایسے نشانات راہ بھی پائے جاتے ہیں جن کی مدد سے اس کی پیدا کی ہوئی بہت سی الجھنوں کو دور بھی کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ ان کو اچھی طرح اجاگر کیا جا سکے اور قرآنی حکمت کی کسوٹی پر ان کو پرکھا جا سکے۔ اس مقصد کے تحت اس رسالے میں جو مضامین شائع ہونگے انشاء اللہ وہ ان ذہنوں کے لئے تریاق کا کام دیں گے جو جدید فکر و فلسفہ سے متاثر یا مسموم ہیں اور جو ہر بات کو صرف عقل کی میزان میں تولنا چاہتے ہیں۔

خاص مسلمانوں کے لئے اس رسالے کی دعوت یاایھا الذین اٰمنوا اوفوا بالعقود (۱۔ مائدہ) کی دعوت ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے آخری رسول کے واسطہ سے ہم نے اس کی جس آخری شریعت کی اطاعت اور پابندی کا عہد کیا ہے ہم میں سے ہر ایک کا فرض ہے کہ پوری وفاداری کے ساتھ اس شریعت کی پابندی کرے۔ یہ شریعت ہمارے اور ہمارے رب کے درمیان ایک میثاق کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہم سمعنا واطعنا کہہ کر اس میثاق میں شامل ہوئے ہیں اور ہماری بندگی اور وفاشعاری کا تقاضا یہ ہے

کہ اس میثاق کے مطالبات پوری ایمان داری کے ساتھ ادا کریں۔ یہی میثاق درحقیقت وہ حبل اللہ ہے جو ہمیں خدا کے ساتھ جوڑتی اور ہمیں دنیا و آخرت میں ان نعمتوں کا حقدار بناتی ہے جن کا خدا کی طرف سے وعدہ کیا گیا ہے۔ اگر یہ حبل اللہ ٹوٹ جائے تو پھر خدا سے ہمارا تعلق ہی سرے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کے بعد اگر ہمیں قومی اور اجتماعی حیثیت سے جینے کی کوئی مہلت ملتی ہے تو اس کی حیثیت بس ایک مہلت کی ہے۔ یہ مہلت اس لئے نہیں ملتی کہ ہم عزت کے ساتھ جینے کے حقدار ہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی مقررہ سنت کے تحت محض اس لئے ملتی ہے کہ ڈوبنے کے لئے ہماری کشتی اچھی طرح بھر جائے۔ اس مہلت کے دوران میں اگر زندگی کے کسی گوشے میں چمک دمک کے کچھ آثار بھی نظر آئیں تو اس سے بھی کسی دھوکے میں نہیں پڑنا چاہیئے۔ اس کی مثال مریض کے اس سنبھالے کی سی ہے جو وہ دم توڑنے سے پہلے لیا کرتا ہے۔

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ وسوسہ پیدا ہو۔ کہ سمعنا و اطعنا کا اقرار کر کے خدا سے کوئی عہد و میثاق باندھا ہے تو ان لوگوں نے باندھا ہے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھے اس عہد و میثاق کی ذمہ داری ان لوگوں پر کس طرح عاید ہوتی ہے جو بعد کے زمانوں میں پیدا ہوئے؟ اس وسوسے سے اپنے ذہن کو پاک رکھنے کے لئے یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ جب تک ہم اللہ کو اپنا رب، قرآن مجید کو اس کا صحیفۂ آسمانی، محمد رسول اللہ ﷺ کو اپنا واجب الاطاعت ہادی اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس امت کا ہراول دستہ مانتے ہیں اس وقت تک ہم اس سمعنا و اطعنا کی ذمہ داری سے انکار کرنے کا حق نہیں رکھتے جس کا اقرار صحابہ رضی اللہ عنہم نے کیا۔ اس اقرار کی ذمہ داری صحابہؓ نے اپنے بعد آنے والی نسلوں کی طرف منتقل کی اور پھر ان سے یہ ذمہ داری درجہ بدرجہ بعد کی نسلوں کی طرف منتقل ہوتی رہی۔ ہر عہد کے اخیار و صالحین نے اس ذمہ داری کو اپنے اسلاف کا سب سے زیادہ مقدس ورثہ سمجھا۔ اور اس ذمہ داری کو اٹھانے کے لئے جو اقرار صالح اگلوں نے کیا تھا پچھلوں نے بھی اس کو اپنا اقرار صالح تسلیم کیا۔ اس لئے کہ اس اقرار کا انکار یا اس سے گریز و فرار ان کے لئے اس وقت تک ممکن ہی نہ تھا جب تک وہ اپنے ان اسلاف سے خدانخواستہ برأت کا اور اسلام سے اپنے قطع تعلق کا اعلان نہ کر دیں۔

ہم اگر ان مقدس اسلاف ہی کے خلف ہیں اور اپنے اس ماضی سے بیزار نہیں ہو گئے ہیں۔ تو

سمع وطاعت کا جو اقرار ہمارے اسلاف نے کیا ہے وہ خود ہمارا بھی اقرار ہے اور ہم اپنی ناخلفی کا اعلان کئے بغیر اس اقرار کی ذمہ داریوں سے انکار نہیں کر سکتے۔ اگرچہ یہ ایک بالکل کھلی ہوئی حقیقت ہے جس کو کوئی مسلمان جھٹلانے کی جرأت نہیں کر سکتا لیکن اس کے ساتھ ہی مندرجہ ذیل حقیقتوں سے بھی کوئی صاحب نظر انکار نہیں کر سکتا۔

ہم میں بہت سارے لوگ ایسے ہیں جو سرے سے اس بات سے واقف ہی نہیں ہیں کہ ہمارے رب کے ساتھ ہمارا تعلق کسی میثاق کے تحت ہے اور اس میثاق کی ہر چیز لکھی ہوئی اور متعین ہے اور ہم نے سمعنا واطعنا کے اقرار کے ساتھ اس کی تصدیق کی ہے۔ ان لوگوں کا تعلق خدا کے ساتھ محض رسمی اور رواجی ہے اور اگر وہ کسی حد تک اس کو نباہتے ہیں تو اسی حیثیت سے اس کو نباہتے ہیں نہ اس کے اندر کوئی زندگی ہے نہ کوئی اثر۔

ہم میں بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو اس معاہدے کی بہت سی دفعات سے متعلق مختلف قسم کے شکوک وشبہات میں مبتلا ہیں۔ ان میں سے بعض اپنے شبہات وشکوک کو برملا ظاہر بھی کرتے ہیں۔ بعض ان کو ظاہر تو نہیں کرتے لیکن ان کو اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں جس کے سبب سے وہ نفاق اور بے یقینی کے مریض بن کر رہ گئے ہیں۔

بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو اس میثاق کی دفعات میں سے صرف انہی دفعات کو ماننا چاہتے ہیں جو ان کی خواہشوں کے مطابق ہیں۔ ان دفعات کو یہ نظر انداز کر دینا چاہتے ہیں جو ان کی خواہشات کے خلاف ہیں۔ یہ ترک و اختیار وہ من مانے طور پر یک طرفہ کر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک معاہدہ ہے۔ جو ان کے اور ان کے رب کے درمیان ہوا ہے جس میں کوئی ادنے تغیر و تبدل بھی وہ خدا کی مرضی کے بغیر کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ انہوں نے اس رد و قبول کے لیے کسوٹی تہذیب حاضر کو قرار دیا ہے جو چیز اس کسوٹی پر پوری اتر جائے وہ سر آنکھوں پر اور جو چیز اس پر پوری نہ اتر سکے وہ ناقابل التفات۔

بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو مختلف قسم کی طفلانہ تاویلوں سے اس پورے میثاق کو ایک بازیچۂ اطفال بنائے دے رہے ہیں اور اس کی ہر دفعہ کی ایسی ایسی تاویلیں کر رہے ہیں جن سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ان کے پیش نظر مقصد تو درحقیقت پورے میثاق کا انکار ہے لیکن کھلم کھلا

انکار کے بجائے انہوں نے تاویل باطل کی راہ اختیار کی ہے۔

بعض لوگوں نے سرے سے اس ذات ہی کو مجروح کرنا شروع کر دیا ہے جو اس میثاق کا اصل واسطہ ہے اور جس نے خدا کے نمائندے کی حیثیت سے ہم سے یہ میثاق لیا ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک اس میثاق کا وہ سارا ریکارڈ مشتبہ ہے جو اس ذات کے قول و فعل سے متعلق ہے۔

بعض لوگوں نے حکمت عملی یا عملی سیاست کے نام سے اس میثاق کی قطع و برید کے لئے دین میں ایک نئے اصول ردّ و قبول کا اضافہ کیا ہے۔ ان کے نزدیک عملی سیاست کے تقاضوں کے تحت اس میثاق کی ہر دفعہ کالعدم کی جاسکتی ہے۔

یہ رسالہ مذکورہ بالا سارے گروہوں کی غلطیوں اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کریگا اور ان شاء اللہ ہر باب میں اس کا انداز بحث علمی اور تحقیقی ہوگا۔ اس میں نقل کے ساتھ ساتھ عقل کو بھی وہ اہمیت دی جائے گی جس کی وہ مستحق ہے تاکہ وہ لوگ بھی ان مباحث سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں جو جدید نظریات کے شعبدوں سے متاثر ہیں۔ اس طرح کے لوگ ان شاء اللہ اس رسالہ کے ہر نمبر میں اپنے لئے نہایت روح پرور اور صحت بخش غذا پائیں گے۔ ہمارے کالجوں میں بھی اور دینی مدرسوں میں بھی ایسے بہت سے ذی صلاحیت اور ذہین لوگ موجود ہیں جو خدا کی شریعت کو ان پہلوؤں سے سمجھنا چاہتے ہیں جن پہلوؤں سے موجودہ عہد میں اس کو سمجھنا ضروری ہے۔ لیکن وہ اپنی اس تشنگی کو دور کرنے کا کہیں سامان نہیں پا رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ رسالہ کے اس باب کے مضامین ان کے لئے اچھا فکری مواد فراہم کریں گے۔

اب میں دعا کیلئے ہاتھ اٹھاتا ہوں اور اس رسالہ کے تمام قارئین سے اس دعا پر آمین کہنے کی درخواست کرتا ہوں۔ اے رب! تیرے چند عاجز بندوں نے تیرے دین کی ایک حقیر سی خدمت انجام دینے کے لئے یہ کام شروع کیا ہے۔ اے رب تو اس کام کو قبول فرمانے والا، سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اے رب ہم تیرے ساتھ اپنے عہد کو تازہ کرنے کا عزم کرتے ہیں تو اس عزم میں ہماری مدد فرما اور اے رب ہمیں تو توفیق دے کہ ہم تیرے دوسرے بندوں کے اندر بھی اس عزم کی گرمی پیدا کر سکیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

ایک طویل غیر حاضری کے بعد میثاق اپنے قدر دانوں کی خدمت میں پھر حاضر ہو رہا ہے۔ اس غیر حاضری پر مجھے بڑی ندامت ہے لیکن اس دوران میں حالات کچھ ایسے رہے کہ میں اپنے آپ کو بالکل مجبور سمجھتا ہوں۔ ..... اب میں نے بہت سوچ بچار کے بعد رسالے کو کلیتہً برادرم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے حوالہ کر دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب سلمہٗ ایک دین، سرگرم، اسلامی ذہن و فکر رکھنے والے نوجوان اہلِ قلم ہیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ نہ صرف رسالے کو پابندی کے ساتھ جاری رکھ سکیں گے بلکہ میں ان کی محنت اور قابلیت سے یہ توقع بھی رکھتا ہوں کہ وہ صوری اور معنوی دونوں ہی اعتبار سے اس کے معیار کو اونچا کریں گے۔ دعا کیجئے کہ میری یہ توقع پوری ہو۔

رسالے کو ڈاکٹر صاحب کے سپرد کر دینے سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اب میرا کوئی تعلق اس کے ساتھ باقی نہیں رہیگا۔ اس کے انتظامی امور سے تو بے شک مجھے اب کوئی تعلق نہیں ہوگا لیکن میرا قلمی تعاون برابر اس کو حاصل رہیگا۔ میری تفسیر ـــــ تدبر قرآن ـــــ کی قسطیں اس میں پابندی کے ساتھ نکلتی رہیں گی۔ دوسرے مذہبی، علمی اور سیاسی مسائل بھی، جن پر میں اظہارِ خیال ضروری سمجھوں گا میرے قلم سے اس میں زیر بحث آتے رہیں گے۔ رسالے کا مقصد اور اس کا نصب العین بھی وہی ہے گا جو اب تک رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ابتدا سے نہ صرف اس کے قدر دانوں میں سے ہیں بلکہ برابر اس کے معاونوں میں سے رہے ہیں۔ جس مقصد کے لئے یہ پرچہ نکالا گیا تھا وہ جس طرح مجھے عزیز ہے اسی طرح انہیں بھی عزیز ہے۔ اس وجہ سے مقصد کے معاملے میں بھی کسی رجعت یا انحراف کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ بلکہ توقع یہ ہے کہ اس پہلو سے بھی اس میں ترقی ہوگی۔ جو رفقاء اب تک اپنے قلمی تعاون سے میرا ہاتھ بٹاتے رہے ہیں وہ انشاء اللہ بدستور ڈاکٹر صاحب کا بھی ہاتھ بٹاتے رہیں گے۔

ـــــ امین احسن اصلاحی

الحمد للہ وکفیٰ والصلوٰۃ والسلام علی عبادہ الذین اصطفی اما بعد

فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم

جماعت اسلامی کی پالیسی پر اپنے تنقیدی بیان کی اشاعت کے بعد میں اس بات کی ضرورت محسوس کر رہا تھا کہ ایک پرچہ ایسا ہونا چاہیے جو اسی دعوت تجدید و احیائے دین کا علمبردار ہو جسے لیکر جماعت اسلامی اٹھی تھی۔ اسی غرض سے ایک ہفتے کے ڈیکلریشن کی درخواست بھی میں نے متعلقہ حکام کو دے دی تھی جو بفضلہٖ تعالیٰ منظوری کے جملہ مراحل طے کر چکی ہے۔ لیکن عین وقت پر مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے حکم دیا کہ کوئی نیا پرچہ نکالنے کے بجائے "میثاق" کو سنبھالو، چنانچہ مولانا کے حکم کی تعمیل میں میں آج قارئین میثاق کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہوں۔

"میثاق" کی ادارت کی ذمہ داری کو میں کسی نئے پرچے کے مقابلے میں بہت بھاری محسوس کر رہا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "میثاق" اپنا ایک ماضی رکھتا ہے اور اس کا ایک معیار متعین ہو چکا ہے، ادھر مجھے اپنی کم مائگی اور نا تجربہ کاری کا شدید احساس ہے۔ میں اس ذمہ داری کو ہرگز قبول نہ کرتا اگر مولانا مجھے پختہ یقین نہ دلا دیتے کہ ان کا پورا تعاون "میثاق" کو حاصل رہے گا اور وہ اس کی سرپرستی حسب سابق فرماتے رہیں گے۔

جیسا کہ مولانا نے تحریر فرمایا ہے، مجھے "میثاق" کے حلقے میں اول روز سے شرکت کا شرف حاصل ہے اور جن مقاصد کے تحت اس پرچے کا اجراء ہوا تھا ان سے مجھے کلیتہً اتفاق ہے لہٰذا "میثاق" کے اس دورِ جدید کے افتتاح کے موقع پر اپنی جانب سے کچھ کہنے کے بجائے میں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی وہی تحریر من و عن شائع کر رہا ہوں جو آج سے سات سال قبل "میثاق" کے اجراء کے موقع پر پرچے کے مقاصد اور اس کی پالیسی کے خطوط کی تعیین کے لئے مولانا نے قلمبند فرمائی تھی۔ میری زیر ادارت "میثاق" انشاء اللہ انہی مقاصد کے حصول کے لئے کوشاں رہے گا۔

سب سے آخر میں قارئین میثاق سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ میرے لئے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ میرے دل و دماغ کو حق کی قبولیت اور زبان و قلم کو حق کے اظہار کی توفیق اور صلاحیت عطا فرمائے۔ آمین

خاکسار

اسرار احمد

میثاق جولائی ۱۹۶۶ء

متحدہ شریعت محاذ اور تنظیمِ اسلامی

اسرار احمد

صوبۂ سرحد سے سینیٹ کے دو معزز اراکین، مولانا سمیع الحق اور قاضی عبداللطیف کی جانب سے پیش کردہ شریعت بل نہ صرف موجودہ اربابِ اقتدار بلکہ تمام مسلمانانِ پاکستان کے لیے ایک شدید آزمائش کی صورت اختیار کر گیا ہے ـــــ اس سے قبل صوبۂ سرحد یہ اعزاز بھی حاصل کر چکا ہے کہ اُس کی صوبائی اسمبلی نے شریعت کی بالادستی کے حق میں باضابطہ قرارداد منظور کی ـــــ اِس پر بلاشبہ سرحد کے عوام اور اُن کے نمائندگان جملہ اسلامیانِ برِّ عظیم پاک و ہند کی جانب سے ہدیۂ تبریک کے مستحق ہیں۔ اِس لیے کہ پاکستان کے قیام میں اصل فیصلہ کُن مساعی اُن علاقوں کے مسلمانوں ہی کی تھیں جو اَب بھارت میں شامل ہیں اور ان جملہ مساعی کی اصل غرض و غایت اللہ کے دین کی سربلندی اور اسلامی طرزِ زندگی کے احیاء کے سوا اور کچھ نہ تھا!

پاکستان کی موجودہ مرکزی حکومت، اس سے قطع نظر کہ اسے خود اپنے وجود کے لیے دستوری اور اخلاقی جواز کس حد تک حاصل ہے، اس معاملے میں "نہ جائے ماندن، نہ پائے رفتن" کی سی صورتِ حال سے دوچار ہے۔ خود اُس نے پیش قدمی کر کے دستور میں نویں ترمیم کا جو بل سینیٹ سے منظور کروایا تھا، وہ بھی سانپ کے منہ میں چھچھوندر بن کر رہ گیا ہے ـــــ چنانچہ اسے بھی نیشنل اسمبلی میں نہیں لایا گیا ـــــ اور سابق سپیکر جناب فخر امام کا بیان ریکارڈ پر آچکا ہے کہ نوّے دن سے زائد عرصہ گزر جانے کے باعث اُس کی سینیٹ کی منظوری بھی غیر مؤثر اور کالعدم ہو چکی ہے ـــــ واللہ اعلم! ـــــ اب وزیرِ اعظم محمد خاں جونیجو نے یہ مؤقف اختیار کیا ہے کہ حکومت خود اپنی جانب سے 'شریعت بل' پیش کرے گی ـــــ زہے یہ سوالات کہ اس کی نوبت کب آئے گی؟ اور اُس بل کی نوعیت کیا

ہوگی! تو ظاہر ہے کہ ان کے جوابات تا حال پردۂ غیب میں ہیں۔ اگرچہ قرائن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی ایسی گول مول اور غیر مؤثر چیز ہوگی جو تہذیبِ جدید کے دلدادگان اور حاکمیتِ عوام کے علمبرداروں کے ہاتھ نہ آ رہ سکے!

مولانا سمیع الحق اور قاضی عبدالطیف کے پیش کردہ بل کی بعض خامیوں کی جانب اسلامی نظریاتی کونسل نے توجہ مبذول کرائی — اور بعض پہلوؤں کو علماء کرام کے مختلف حلقوں نے قابلِ اصلاح قرار دیا — چنانچہ حال ہی میں تمام مکاتبِ فکر کے علماءِ کرام کی ایک کمیٹی نے اس بل کا تجزیہ کر کے بعض ترامیم کر دی ہیں اور اس کو تمام مکاتبِ فکر کا مشترکہ شریعت بل قرار دیا ہے۔ اور اسے منظور کرانے کی جدّ و جہد کے لیے ایک "متحدہ شریعت محاذ" وجود میں آگیا ہے!

اس متحدہ شریعت محاذ میں وہ تمام اہم مذہبی عناصر جمع ہیں جنہوں نے صدر ضیاء الحق کی سابقہ خاص مارشل لائی حکومت کے دوران حکومت اور ایم آر ڈی کے بین بین روش اختیار کی تھی اور پھر صدر صاحب کے ترمیم کردہ دستور کے تحت منعقد ہونے والے غیر جماعتی انتخابات میں حصّہ بھی لیا تھا، جیسے جماعتِ اسلامی بحیثیتِ مجموعی، جمعیت علماءِ اسلام کا مولانا درخواستی گروپ، جمعیت اہلحدیث کا میاں فضل حق گروپ اور بریلوی مکتبِ فکر کے بعض مقتدر اور مسلّمہ حیثیت کے حامل علماءِ کرام ان اہم جماعتوں کے ساتھ ساتھ بعض دوسری چھوٹی دینی تنظیمیں اور انجمنیں بھی اس متحدہ محاذ میں شامل ہوگئی ہیں جن میں سے ایک تنظیمِ اسلامی بھی ہے!

اس کے بالمقابل بعض دوسرے دینی حلقے اس شریعت بل اور متحدہ شریعت محاذ کی مخالفت ڈنکے کی چوٹ کر رہے ہیں۔ ان میں سے جمعیت علماءِ اسلام کا مولانا فضل الرحمٰن گروپ تو ایم آر ڈی کا فعال اور مؤثر جزو ہے، جمعیت اہلحدیث کے علامہ احسان الٰہی ظہیر گروپ کو بھی ایک نسبت ایم آر ڈی سے حاصل رہی ہے اس لیے کہ علامہ صاحب موصوف تحریکِ استقلال کے ناطے ایم آر ڈی میں شامل رہے ہیں، رہی جمعیت علماءِ پاکستان

جس کے قائدِ اعلیٰ مولانا نورانی میاں ہیں تو وہ اگرچہ ایم آر ڈی میں تو کبھی شامل نہیں ہوئی، تاہم اُس کا سیاسی مُوقف وہی ہے جو ایم آر ڈی کا ہے۔

اِس معاملے میں راقم الحروف اور تنظیم اسلامی کا مُوقف بعض حضرات کے لیے حیرانی کا باعث ہُوا ہے لہٰذا اس کی قدرے وضاحت لازمی ہے:

سیاسی معاملات میں راقم کا مُوقف بالکل وہی ہے جو ایم آر ڈی کا یا مولانا نورانی میاں کا یا علامہ احسان الٰہی ظہیر صاحب کا ہے۔ چنانچہ راقم کے نزدیک اوّلاً وہ ریفرنڈم جس کی اساس پر ضیاء الحق صاحب صدر بنے ہوئے ہیں، پاکستان کی چالیس سالہ دستوری تاریخ کا سب سے بڑا فراڈ تھا، ــــ ثانیاً ضیاء الحق صاحب کو کوئی حق حاصل نہ تھا کہ ۷۳ء کے متفق علیہ دستور میں من مانی ترامیم کر دیں، ثالثاً اِس ترمیم شدہ دستور کے تحت منعقد ہونے والے غیر جماعتی انتخابات اور اُن کے نتیجے میں قائم ہونے والی مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو کوئی دستوری اور اخلاقی جواز نہیں ہے ــــ اور رابعاً ملک کی سلامتی اور سالمیت کا تقاضا یہی ہے کہ جلد از جلد ایسے عام انتخابات جماعتی بنیادوں پر منعقد کیے جائیں جن میں کسی پارٹی کے حصّہ لینے پر کوئی پابندی نہ ہو۔

لیکن دوسری جانب راقم الحروف اور تنظیم اسلامی کے نزدیک شریعت کی بالادستی کا مسئلہ ہر شئے سے بالاتر ہے اور اس معاملے میں عمل کلّیتہً اس اصول پر ہونا چاہیئے کہ "لاتنظروا الیٰ من قال ولکن انظروا الیٰ ما قال" یعنی "یہ نہ دیکھو کہ کہنے والا کون ہے بلکہ یہ دیکھو کہ وہ کہ کیا رہا ہے!" لہٰذا شریعتِ اسلامی کی بالادستی کے مسئلے پر جملہ مسلمانانِ پاکستان کو بلا لحاظِ مسلک و مشرب سیاسی مسائل کے ضمن میں اپنے اختلافِ رائے کو برقرار رکھتے ہوئے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جانا چاہیئے ــــ بالکل ایسے جیسے ایم آر ڈی میں شامل جماعتیں اپنے تمام تر اختلافات کے باوجود چند نکات پر مجتمع ہو گئی تھیں! ــــ چنانچہ خود راقم الحروف نے اب سے لگ بھگ چھ ماہ قبل ایک "متحدہ مذہبی محاذ" یا "تحفظ شریعت محاذ" کے قیام کی تجویز پیش کی تھی جس کی تفصیلی وضاحت اپریل ۸۶ء

کے میثاق، میں شائع ہوئی تھی — موجودہ "متحدہ شریعت محاذ"، چونکہ اس کے قبیل ہی کی نہیں بلکہ اس سے بھی آگے کی بات ہے۔ لہٰذا راقم اپنے جمیع رفقاء کار سمیت اس میں شرکت کو اپنے حق میں موجب سعادت سمجھتا ہے۔ اور اُن بزرگ علماء و زعماء کا شکریہ ادا کرتا ہے جنہوں نے راقم الحروف اور تنظیم اسلامی کو اس مبارک کام میں شرکت کا اہل سمجھا اور اس کی دعوت دی۔

ساتھ ہی ہم مولانا سید حامد میاں مدظلہ اور مولانا فضل الرحمٰن صاحب، مولانا نورانی میاں بالقابہ اور مولانا عبدالستار خان نیازی، اور علامہ احسان الٰہی ظہیر اور ان کے رفقاء و احباب سے بھی پُرزور استدعا کرتے ہیں کہ وہ بھی اپنے سیاسی مؤقف کو برقرار رکھتے ہوئے شریعتِ اسلامی کی بالادستی کی اِس اجتماعی جدّوجہد میں شریک ہوں اور یہ ثابت کردیں کہ جملہ اسلامیانِ پاکستان دینِ حق کی اِقامت اور شریعتِ اسلامی کے نفاذ کے معاملے میں متفق و متحد ہیں! ان شاء اللہ العزیز وہ اس ایثار اور قربانی پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے اجرِ عظیم کے مستحق ہوں گے!

زیرِ بحث شریعت بل اور شریعت محاذ کے بارے میں بہت سے سیاسی معاملات کی سوجھ بوجھ رکھنے والے حضرات کی رائے یہ ہے کہ یہ سب صدر ضیاء الحق صاحب کا سیاسی کھیل ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ بعض آثار و قرائن سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے لیکن راقم کے نزدیک اوّلاً تو ایسی تمام باتیں ظن و تخمین کے درجے میں آتی ہیں جبکہ نفاذِ شریعت کا معاملہ حتمی اور یقینی طور پر ہم سب کا فرض ہے — ثانیاً افراد، خواہ کسی وقت وہ کتنے ہی بڑے نظر آتے ہوں، حقیقت میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے — اصل اہمیت کا حامل مسئلہ ملک و ملت کا ہے۔ اشخاص کا معاملہ تو یہ ہے کہ ع "جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا، یہی ہے اِک حرفِ محرمانہ!" — البتہ دین اور شریعت کی جانب اُٹھا ہوا، ہر قدم — اور اُس کے ضمن میں کی جانے والی ہر کوشش اَمر ہو جائے گی! چنانچہ نفاذِ شریعت

علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسلام کے ضمن میں تو اگر ہمیں آنکھوں دیکھتے مکھی نگلنی پڑے تو ہمیں اس کے لیے بھی تیار رہنا چاہیئے!

اِس ضمن میں صدر ضیاء الحق صاحب کی مرحوم مجلسِ شوریٰ کے ایک معزز رکن جسٹس (ریٹائرڈ) بشیر الدین خاں کی ایک نہایت دلچسپ تحریر روزنامہ 'نوائے وقت' میں شائع ہوئی ہے جس کا عکس قارئینِ 'میثاق' کی ضیافتِ طبع کے لیے ذیل میں شائع کیا جا رہا ہے۔

شریعت بل ــــ نیا خدشہ

بشیر الدین خاں (ریٹائرڈ چیف جسٹس)

- - - - - - - - - - - - - - ان امور کا تعلق فقہ سے ہے اور اس فقہی اختلافات میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ چار مختلف فقہ تو پہلے ہی موجود ہیں اور پانچواں فقہ جعفریہ ہے۔ شریعت بل کے سلسلہ میں کشمکش ۱۹۹۰ء تک چلی جائے گی اور اس کا فائدہ جیسا کہ ظاہر ہے موجودہ حکومت کو ہو گا۔ بالآخر آئندہ انتخابات کے نزدیک جا کر حکومت اس شریعت بل کو خود پاس کرائے گی اور وہ اس کے نتیجہ میں نہ سیاسی جماعتیں اور نہ ہی قومی یا صوبائی اسمبلیاں رہیں گی بلکہ ختم ہو جائیں گی۔ کیونکہ اسلام میں ان کا کوئی تصور نہیں البتہ جو صاحب بھی اس وقت صدر ہوں گے وہ اپنے عہدہ پر برقرار رہیں گے اور امیر المومنین کہلائیں گے۔ اور وہ اپنی مشاورت کے لئے سو ڈیڑھ سو افراد اکٹھے کریں گے اور ان کے مشورہ کے وہ گویا پابند نہیں ہوں گے تاہم حکومت کے کاروبار میں ان کی مشاورت شامل ہو گی۔ آئندہ یہی مشاورتی کونسل امیر المومنین منتخب کیا کرے گی جیسا کہ خلفاء راشدین کے دور میں ہوتا آیا اور اس طرح پاکستان میں ایک خالص اسلامی حکومت ان خطوط پر قائم ہو جائے گی اور روز مرہ کا مغربی طرز کی جمہوریت کے لئے مطالبہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔ جس کے اخراجات کا یہ ملک متحمل نہیں ہو سکتا۔

واقعہ یہ ہے کہ ہمارے لیے یہ فیصلہ کرنا تو مشکل ہے کہ اس تحریر کو محترم پیر پگاڑا صاحب کی 'پُھلجھڑیوں' کے قبیل کی شے قرار دیں یا کسی روزنامے کے فکاہی کالم کے مشابہ سمجھیں یا کسی 'مجذوب' کی بڑ، شمار کریں ــــ البتّہ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ متذکرہ بالا تینوں ہی قسم کی چیزوں میں بعض اوقات بڑی پتے کی باتیں موجود ہوتی ہیں جیسی کہ خود اس تحریر میں موجود ہیں۔ خود راقم الحروف کو

یہ تحریر پڑھ کر ۱۹۶۴ء میں کراچی کے نشتر پارک میں منعقدہ ایک جلسے کی خواجہ ناظم الدین مرحوم کی تقریر یاد آگئی جس میں انہوں نے سابق صدر ایوب خاں مرحوم کے بارے میں یہ اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ اگر یہ شخص صدارتی انتخاب جیت گیا تو اوّلاً اپنی بادشاہی کا اعلان کرے گا اور پھر گوہر ایوب کو اپنا ولی عہد مقرّر کرے گا۔ یاد ہوگا کہ ماضی قریب میں کچھ ایسی ہی تجویزیں پوری سنجیدگی کے ساتھ ضیاء الحق صاحب کے ضمن میں سابق وزیر دفاع جناب علی احمد تالپور پیش کرتے رہے ہیں۔ لیکن آج صدر ایوب خاں تو مرحوم ہو کر ماضی کا جزو بن چکے ہیں۔ اور جناب تالپور جیتے جی ایسے ہو گئے ہیں جیسے کبھی تھے ہی نہیں! ــــ اسی طرح زمانے کی ایک دو کروٹوں کے بعد نہ جناب ضیاء الحق ہوں گے نہ اُن کے حامی نہ مخالف ــــ اس لیے کہ بقولِ الفاظِ قرآنی " كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ۝ " ــــ سدا رہنے والی ذات تو صرف اللہ کی ہے۔ البتہ جو اعمال اس کی رضا کے لیے کیے جائیں انہیں بھی دوام حاصل ہو جاتا ہے!

اِس ضمن میں راقم الحروف اور تنظیمِ اسلامی کے مؤقف کے سلسلے میں دو مزید امور کی صراحت ضروری ہے:

ایک یہ کہ ہمارے نزدیک اصل اہمیت 'قانون' کی نہیں، 'نظام' کی ہے اور صرف قانونِ اسلامی کے نفاذ سے جملہ مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہو سکیں گے بلکہ ان کے حصول کے لیے اسلام کا کامل نظامِ عدل و قسط رائج کرنا ہوگا اور اجتماعی زندگی کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی گوشوں میں شریعتِ حقّہ کے اصل مقاصد کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہوگا ــــ اور یہ صرف ایک کامل اسلامی انقلاب ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ چنانچہ ہم اپنی اصل توانائیاں تو اسی کے مقدمات و لوازم کی تکمیل یا بالفاظِ دیگر انقلابِ اسلامی کی 'تمہید' کی کوشش میں صرف کر رہے ہیں ــــ تاہم اس دوران میں قرآنی اصول " تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ "

کے مطابق نفاذِ شریعت کی ہر کوشش میں بھرپور تعاون کریں گے۔ اس لئے کہ ہمارے پیشِ نظر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان مبارک بھی ہے، کہ "اِقَامَۃُ حَدٍّ مِن حُدُودِ اللّٰہِ خَیرٌ مِن مَطَرِ اَربَعِینَ لَیلَۃٍ" یعنی "اللہ کی حدود میں سے ایک حد کا اجراء بھی چالیس روز کی بارش سے زیادہ بابرکت ہے!"

دوسرے یہ کہ یہ شریعت بل اپنی موجودہ ترمیم شدہ صورت میں بھی 'حرف آخر' نہیں ہے۔ اس میں باہمی مشورے سے مزید ترامیم بھی کی جاسکتی ہیں۔ خود راقم کی ذاتی رائے بعض معاملات میں کسی قدر مختلف ہے (جو 'میثاق' کی اشاعت بابت اگست ۸۶ء میں تفصیلاً بیان ہوچکی ہے) لیکن جیسے کہ اس سے قبل عرض کیا جاچکا ہے دین کے تقاضے اور ملت کے مصالح انفرادی آراء سے بالاتر ہیں۔ بقول اقبال ؎

قبائل ہوں ملت کی وحدت میں گم کہ ہو نام اسلامیوں کا بلند!

ضرورت اِس امر کی ہے کہ کھلے دِل کے ساتھ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوں — اور باہمی افہام و تفہیم کی فضا میں کسر و انکسار کے اصول پر متفقہ مؤقف اختیار کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو خیر کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین! ثم آمین!!

— اقتباس از 'تذکرہ و تبصرہ' 'میثاق' بابت اپریل ۱۹۸۶ء —

"۔ ۔ ۔ ۔ تاہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان مبارک "الدِّینُ النَّصِیحَۃ" پر عمل کرتے ہوئے حسب ذیل گذارشات جملہ خادمانِ دین اور اکابرِ ملتِ اسلامیہ پاکستان کی خدمت میں پیش ہیں:

۱۔ فیڈریشن یا کنفیڈریشن یعنی مرکز اور صوبوں کے مابین ذمہ داریوں اور اختیارات کی تقسیم کا معاملہ ہو یا صوبوں کی از سرِ نو تشکیل یا تقسیم کا معاملہ —— اسی طرح خواہ علاقائی قومیتوں کے حقوق کا مسئلہ ہو خواہ علاقائی زبانوں کے تحفظ کا معاملہ —— یہ جملہ امور خالص سیاسی ہیں اور ان کا دین کے ساتھ تعلق صرف بالواسطہ اور ثانوی ہے، براہِ راست نہیں، لہٰذا اِن کی اساس پر کسی سیاسی اتحاد کی بات

تو ہو سکتی ہے لیکن انہیں کسی دینی اتحاد کی اساس بنانا خود دین و مذہب کی مصلحت کی رُو سے درست نہیں ہے۔

۲۔ البتہ اسلامی نظام کے قیام یا نظامِ مصطفیٰ کے نفاذ اور شریعتِ اسلامی کی کلی اور ہمہ گیر تنفیذ کو ایک دینی اتحاد کی مثبت اساس بنایا جائے تو یہ نہایت مستحسن اقدام ہوگا۔ اور اس میں کم از کم اُن جملہ جماعتوں کی شرکت و شمولیت معقول بھی ہوگی اور مطلوب بھی جو اس مقصد کے حصول کے لئے جمہوری اور انتخابی طریق کو درست اور مناسب سمجھتی ہیں ـــــ اور اگرچہ خود راقم الحروف اور اس کی قائم کردہ 'تنظیم اسلامی' کی حتمی رائے یہ ہے کہ یہ مقصد انتخابات کے راستے سے نہیں بلکہ صرف 'انقلاب' کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے ـــــ تاہم اگر ایسا کوئی اتحاد ممکن العمل ہو تو اس کے ضمن میں ہم نہ صرف دعا گو رہیں گے بلکہ بالواسطہ طور پر اسے ہر ممکن طریقے سے تقویت بھی پہنچائیں گے ـــــ

ہر صاحب درد مسلمان تسلیم کرے گا کہ ایسے متحدہ محاذ محاذ کا قیام وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ اس لئے کہ ہمارے یہاں اب تک ہوا یہ ہے کہ جملہ دینی جماعتیں تو اپنے اپنے طریق کار کے مطابق کُل دین حق کی اقامت یا کامل نظامِ مصطفیٰ کے نفاذ کے لئے کوشاں رہیں اور اس ضمن میں اپنے اپنے طریق کار پر عمل پیرا رہیں اور اپنے خیال کے مطابق آگے ہی کی جانب دیکھتی رہیں۔ لیکن اس اثنا میں الحاد اور اباحیت نے ہمارے معاشرے میں بھرپور نقب لگا لی۔ نتیجۃً احوالِ اجتماعیہ میں تو شریعت کے کلی نفاذ کے ضمن میں کوئی پیش قدمی نہ ہو سکی تھی نہ ہوئی، اُلٹا لینے کے دینے پڑ گئے اور الحاد و اباحیت نے انکارِ حدیث اور استخفافِ سُنّت کی راہ سے احوالِ شخصیہ تک میں اثر و نفوذ حاصل کر لیا۔ چنانچہ آج ہمارے سامنے ایک عجیب متضاد صورتحال ہے کہ بھارت میں تو مسلمانوں کے عائلی قوانین کے ضمن میں آج تک کسی مضبوط سے مضبوط حکومت کو بھی دخل اندازی کی جرأت نہ ہوئی اور حال ہی میں سپریم کورٹ آف انڈیا کے ایک فیصلے کے خلاف مسلمانانِ بھارت کا ردِّ عمل اس شدت سے ظاہر ہوا کہ راجیو گورنمنٹ کو گھٹنے ٹیکتے ہی بنی اور ادھر پاکستان میں وہ عائلی قوانین جنہیں ۱۹۶۱ء میں شیعہ، اور سُنّی، اہل حدیث اور حنفی، اور دیوبندی اور بریلوی جملہ مکاتبِ فکر کے چوٹی کے علماء نے خلافِ شریعت قرار دیا تھا، وہ پورے پچیس برس سے باضابطہ نافذ ہیں اور سیکولر نقطۂ نظر کی حامل سیاسی جماعتوں پر مستزاد بے پردہ اور مغربی تہذیب کی دلدادہ خواتین و بیگمات اور ان کے ہم خیال اور سرپرست مفکرین و دانشور اسلام کی سماجی قدروں کو تہ و بالا کرنے پر تلے ہوئے ہیں"

خطابِ جمعہ

ڈاکٹر اسرار احمد

شہادت حضرات عمر، عثمان و علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا تاریخی پس منظر

فلسفۂ انقلاب کی روشنی میں

تلخیص و ترتیب : مقبول الرحیم مفتی

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے بارہ ستمبر ۱۹۸۶ء کو جامع مسجد دارالسلام باغِ جناح میں خطاب جمعہ کے دوران "فلسفہ انقلاب" کی روشنی میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسلامی انقلاب کے خلاف انقلاب سے متاثر ہونے والی اندرونی اور بیرونی قوتوں کے ردِ عمل اور اُن کے نتائج کا تاریخی تجزیہ پیش کیا تھا۔ اس تقریر کے بعض اجزاء پر مبنی ایک خبر کی اشاعت پر اہل تشیع نے لاہور میں امیر تنظیم کے خلاف جلوس نکالا اور اُن کا پتلا بھی جلایا۔ تقریر کی اس اہمیت کے پیشِ نظر ہفت روزہ "چٹان" نے ۱۲ ستمبر کی اشاعت میں اس تقریر کو کیسٹ سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر کے من و عن شائع کر دیا۔ ہم ضروری حک و اضافے کے بعد ہفت روزہ "چٹان" کے شکریے کے ساتھ اسے قارئینِ میثاق کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ البتہ فاضل مدیر "چٹان" کی توجہ کتابت کے علاوہ املا کی اُن غلطیوں کی طرف مبذول کرانا بھی ضروری سمجھتے ہیں جو ہماری جدید تعلیم یافتہ نسل کی اسلام اور تاریخِ اسلام سے ناآشنائی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ (ادارہ)

خطبۂ مسنونہ کے بعد

حضرات آج میرا موضوع "شہادتِ حضرت عمرؓ، شہادتِ حضرت عثمانؓ، شہادت حضرت علیؓ اور شہادتِ حضرت حسینؓ کا تاریخی پس منظر" ہے۔ ان تاریخی واقعات کے منظر اور پس منظر کو سمجھنے کے لئے تاریخ اور فلسفہ تاریخ کے مفہوم اور فرق کو ذہن نشین کرنا بہت ضروری ہے۔ تاریخ میں صرف واقعات کی تفصیلات اور ان کے نتائج بیان کئے جاتے ہیں۔ اُن کے اسباب وعلل اور محرکات وعوامل پر گفتگو نہیں ہوتی۔ جبکہ فلسفۂ تاریخ میں اُن عوامل اور محرکات سے بحث ہوتی ہے جو واقعات کے پس پردہ ہوتے ہیں۔ یعنی یہ واقعات کیوں ظہور پذیر ہوئے کسی کو شکست کیوں اور کسی کو فتح کیوں ہوئی۔ کوئی تہذیب عروج پر کیوں پہنچی اور کوئی زوال سے کیوں دوچار ہوئی۔ اس اعتبار سے ہماری گفتگو کا تعلق تاریخ سے کم اور فلسفہ تاریخ سے زیادہ ہے۔ فلسفہ تاریخ میں بھی اُس کے دو پہلوؤں کے درمیان فرق وامتیاز کو پیش نظر رکھنا لازم ہے۔ ایک شے ہے قوموں کا عروج زوال اور ایک شے ہے نظریات اور تہذیبوں کا عروج زوال۔ ان دونوں کے درمیان زمین وآسمان کا فرق ہے ایک تہذیب ابھری لیکن اُس کے اصل عوامل قومی تھے یعنی کسی نسلی، لسانی یا وطنی بنیاد پر کوئی قوم اُٹھی اُس نے عروج واقتدار حاصل کیا پھر زوال سے آشنا ہوگئی۔ قوموں کا یہ عروج وزوال دو مختلف چیزیں ہیں۔

فلسفۂ انقلاب نظریات کی بنیاد پر جو تبدیلیاں آتی ہیں اُنہیں ہم "انقلابات" کا نام دیتے ہیں مشہور ہندو انقلابی رہنما ایم این رائے نے اپنی کتاب "دی ہسٹاریکل رول آف اسلام" میں اس فرق کو خوب واضح کیا ہے۔ اُس کے مطابق اسلام کا عروج وزوال دُنیا کی دوسری قوموں کے عروج وزوال کے مطابق یا اُن جیسا نہیں۔

قومی بنیادوں پر تاریخ میں بڑی بڑی قومیں اُٹھیں ایک زمانے میں منگولوں نے عروج حاصل کیا، ایک دور میں ہن قوم بڑے زور شور سے اٹھی اور دُنیا پر چھا گئی، سکندر اعظم مقدونیہ سے چلا اور دریائے بیاس تک اپنی فتح کے پھریرے اڑاتا چلا گیا۔ ان فاتحین نے خونریزیاں بھی کیں اور غلبہ واقتدار بھی حاصل کیا لیکن

یہ کسی نئی تہذیب کے بانی نہ بن سکے۔ ان سے دُنیا کو کوئی نئی روشنی نہیں ملی۔ لیکن عرب جب اسلام کی مشعل لے کر نکلے اور انہوں نے اقتدار و حکومت پر قبضہ کیا تو انسانیت کو ایک نئی تہذیب ملی نیا تمدن ملا۔ علوم و فنون کے نئے افق طلوع ہوئے۔ بقول علامہ اقبالؒ

مصطفٰے اندر حرا خلوت گزیں
قوم و آئین و حکومت آفریں

محمد رسُول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نظریاتی تبدیلی برپا کی۔ اس تبدیلی کی علمبردار بھی بلاشبہ ایک قوم تھی ——— "اُمّیین" کی قوم۔ قرآن کے الفاظ میں:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۗ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۙ (سورۃ جمعہ آیت ۲)	وہی ہے جس نے اُمّیوں کے اندر ایک رسول خود انہی میں سے اُٹھایا جو اُنہیں اُس کی آیات سناتا ہے اُن کی زندگی سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے حالانکہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔

یہ "اُمّیین" یعنی بنی اسماعیلؑ امتِ مسلمہ کا قلب یا نیوکلس (NUCLEUS) تو بنے لیکن پھر اُمت میں نئے قبائل اور نئی قومیں شامل ہوتی چلی گئیں۔ اور یوں ایک نئی تہذیب کا آغاز ہوا۔ اس لئے آج ہمیں جن واقعات پر گفتگو کرنی ہے وہ بھی درحقیقت فلسفہ تاریخ کے اُس پہلو کے حوالے سے سمجھ میں آسکتے ہیں جو نظریات اور تہذیبوں کے عروج و زوال سے بحث کرتا ہے اور جس کے لئے زیادہ موزوں عنوان "فلسفہ انقلاب" ہے۔

درحقیقت فلسفہ انقلاب کو سمجھے بغیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا سمجھنا بھی ممکن نہیں ہے۔ اگر فلسفۂ انقلاب پر ذہن کی گرفت مکمل نہیں ہے تو سیرتِ رسولؐ میں بھی

تضادات نظر آئیں گے۔ بظاہر یہ کتنا بڑا تضاد ہے کہ مکے میں حکم یہ ہے کہ چاہے تمہیں دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹا دیا جائے چاہے تمہارے جسم کے ٹکڑے اڑا دیئے جائیں تم ہاتھ نہیں اٹھا سکتے لیکن مدینہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے ساتھی رضوان اللہ علیہم اجمعین اللہ کی راہ میں قتال کر رہے ہیں اور حکم قرآن کے مطابق کر رہے ہیں۔

يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ	وہ اللہ کی راہ میں لڑتے اور مارتے
فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ	اور مرتے ہیں۔

(سورۃ توبہ آیت-۱۱۱)

ایک مثال اور دیکھئے صلح حدیبیہ کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم بظاہر دب کر صلح کر رہے ہیں اور آپؐ کے تمام ساتھیوں کا خون کھول رہا ہے کہ ہم حق پر ہیں اور حق کا یہ حق ہے کہ وہ غالب ہو کر رہے۔ لیکن حضورؐ صلح کر رہے ہیں۔ دو سال بعد مکّہ کے وہی سردار ابوسفیانؓ خوشامد کر رہے ہیں، سفارشیں کروا رہے ہیں کہ صلح کی تجدید فرمالیجئے لیکن حضورؐ تجدید نہیں کر رہے۔ یہ ظاہری تضادات تب رفع ہوتے ہیں جب فلسفۂ انقلاب سمجھ میں آتا ہے۔ اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے۔ انقلاب کے چھ مراحل ہوتے ہیں۔ پہلے تین مراحل۔ دعوت، تنظیم، تربیت ـــــ کے نتیجے میں انقلابی جماعت وجود میں آتی ہے۔ یہ جماعت جب تک اتنی قوی اور مضبوط نہ ہو جائے کہ نظام باطل کو للکار سکے اور اس سے ٹکرا سکے اس وقت تک PASSIVE RESISTANCE یعنی صبرِ محض یا عدم تشدّد کا راستہ اختیار کرے گی۔ ماریں کھائیں گے جیل جائیں گے ہر طرح کا تشدّد برداشت کریں گے لیکن ہاتھ نہیں اٹھائیں گے ـــــ یہ چوتھا مرحلہ ہے لیکن جب یہ محسوس ہو کہ ہمارے پاس اتنی طاقت ہے کہ ہم اس نظام کو جڑ سے اکھاڑنے کے لئے اقدام کر سکتے ہیں تو پھر پانچواں مرحلہ 'ACTIVE RESISTANCE' کا آتا ہے۔ یعنی اب خود آگے بڑھ کر اقدام کیا جائے گا۔ اس کے نتیجے میں چھٹا اور آخری مرحلہ مسلح تصادم (ARMED CONFLICT) کی صورت میں خود بخود سامنے آئے گا۔ فیصلہ کن مرحلہ ہے۔ اگر باقاعدہ تیاری، تنظیم اور منصوبہ بندی سے اقدام کیا گیا ہے، جماعت تربیت یافتہ ہے، تعداد مناسب ہے تو پھر انقلابی قوت کامیاب ہوگی۔ سابقہ نظام کو اکھاڑ کر اپنا

نظام قائم کرے گی۔ لیکن اگر وقت سے پہلے اقدام کیا گیا یا تیاری مکمل نہیں کی گئی تو وہ باطل نظام جو پہلے سے قائم ہے انقلابی جماعت کو کچل دے گا۔ جماعت ختم ہو جائے گی۔ یا تخت یا تختہ۔ تیسرا کوئی امکان نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں انقلابی عمل کے چھ مراحل میں سے پہلے چار مرحلے دعوت، تنظیم، تربیت اور صبر محض مکی دور میں مکمل ہوئے اور آخری دو مرحلے اقدام اور مسلح تصادم مدنی دور میں پایۂ تکمیل کو پہنچے۔ مدینہ میں ACTIVE RESISTANCE یعنی اقدام اور مسلح تصادم کا سلسلہ چھ برس تک جاری۔ پہلا تصادم غزوۂ بدر کی صورت میں رمضان ۲ سنہ ھجری میں ہوا اور ٹھیک چھ برس بعد رمضان ۸ سنہ ھجری میں مکہ فتح ہو گیا۔ عرب کی حد تک انقلاب کی تکمیل ہو گئی۔

تکمیلِ انقلاب کے بعد توسیعِ انقلاب کا مرحلہ آتا ہے۔ ایک سچا انقلاب کسی جغرافیائی یا قومی حدود کا پابند نہیں ہوتا۔ نظریے کو کسی پاسپورٹ اور ویزے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر نظریے میں جان ہے قوت ہے وہ دلیل اور برہان سے مسلح ہے تو پھیلے گا۔ جہاں جڑ پکڑے گا انقلاب لے آئے گا۔ توسیعِ انقلاب کا آغاز بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صلحِ حدیبیہ کے فوراً بعد ۷ سنہ ھجری میں ہی ایران و روم کے حکمرانوں اور بلادِ عرب کے شیوخ کے نام دعوتی خطوط بھیج کر فرما دیا تھا ـــــ جس طرح آج متحدہ عرب امارات اور ان کے اردگرد کے علاقوں میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں اور ان کے شیوخ ہیں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت عہدِ رسالت میں بھی ان علاقوں میں پائی جاتی تھی ـــــ ان خطوط کے جواب میں دو بالکل متضاد ردِ عمل سامنے آئے۔ ایک کسریٰ شہنشاہِ ایران کا ردِ عمل تھا۔ اس نے حضورؐ کا نامۂ مبارک چاک کر دیا سفیرِ اسلام کو قتل کی دھمکی دی اور انتہائی اہانت آمیز سلوک کیا۔ وہ اپنے آپ کو عرب کا حکمران سمجھتا تھا ـــــ ایرانی سلطنت کے نزدیک عرب قبائل کی حیثیت کم و بیش ایسی ہی تھی جیسے حکومتِ پاکستان کے لئے شمال مغربی سرحدی صوبے کے آزاد قبائل کی ہے۔ اگرچہ ہمارے قانون اور عدالتوں کے حدودِ اختیارات وہاں تک نہیں ہیں لیکن بہرحال وہ پاکستان کی حدود میں تو شامل ہیں ـــــ چنانچہ اس نے کہا میری رعیت میں سے ایک شخص کو یہ جرأت کیسے ہوئی کہ اس نے اپنا نام میرے نام سے پہلے لکھا۔ یمن کے ایرانی گورنر باذان کو اس نے خط لکھا کہ مدینے کے کسی گستاخ شخص محمدؐ (نقل کفر کفر نباشد) نے مجھے توہین آمیز خط لکھا ہے۔ اس کو گرفتار کر کے میرے دربار

میں پیش کر دو اور ایسا نہ ہو سکے تو مدینے کی اینٹ سے اینٹ بجا دو۔ یہ ایک نمائندہ ردِ عمل تھا۔ دوسرا نمائندہ ردِ عمل قیصر روم کا تھا۔ اس نے حضورؐ کے ایلچی کا پورا اعزاز و اکرام کیا۔ قیصر اہلِ کتاب میں سے تھا۔ اپنے مذہب کا عالم تھا۔ فوراً حضورؐ کو پہچان گیا۔ اس نے کوشش کی کہ اس کے درباری سپہ سالار، عمائدینِ سلطنت سب اسلام قبول کر لیں۔ جس طرح تاریخ میں اس سے پہلے ایک موقع پر پوری سلطنتِ روم نے بیک وقت (EN BLOC) عیسائیت کو قبول کیا تھا اسی طرح اب اسلام کو اپنا لے۔ تاکہ قبولِ اسلام کیا تھا اسکی سلطنت اور حکومت بھی باقی رہے۔ لیکن ایسا ممکن نہ ہوا۔ سلطنت اس کے پاؤں کی بیڑی بن گئی۔ وہ ایمان کی دولت سے محروم ہی رہا۔ یہی طرزِ عمل مقوقس شاہِ مصر کا بھی تھا۔ اس نے بھی حضورؐ کے ایلچی کا اکرام کیا۔ تحفے تحائف بھیجے۔ لیکن ایمان سے محروم رہا۔ بہرحال یہ دو مختلف ردِ عمل تھے جن کا اظہار اس وقت کی دو بڑی عالمی طاقتوں (SUPER POWERS) کی جانب سے ہوا۔

انقلاب شکن قوتیں اب اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے "فلسفہ انقلاب" کے حوالے سے ایک اصولی بات سمجھ لیجئے۔ جب بھی کسی ملک میں یا کسی معاشرے میں ایک انقلابی قوت آگے بڑھ رہی ہوتی ہے تو وہاں پہلے سے قائم نظام کے چودھری اور اُن کے حامی اور مددگار انقلابی قوت کا راستہ روکنے کیلئے اپنی ساری توانائیاں خرچ کر دیتے ہیں۔ اپنے سارے حربے آزما لیتے ہیں لیکن انقلابی جدوجہد کے آخری مرحلے میں جب وہ دیکھتے ہیں کہ اب ہم انقلاب کا راستہ نہیں روک سکتے۔ ہم شکست کھا چکے ہیں تو ہمیشہ وہ دبک جاتے ہیں۔ بظاہر انقلاب کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ لیکن منتظر رہتے ہیں کہ کوئی موقع ملے اور کوئی نازک مرحلہ آئے تو وار کریں۔ ہر انقلاب کو اِن انقلاب شکن قوتوں اور تحریکوں (COUNTER REVOLUTIONARY FORCES AND MOVEMENTS) کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ قوتیں اندر سے بھی اُٹھتی ہیں اور توسیع انقلاب کے ردِ عمل کے طور پر باہر سے بھی نمودار ہوتی ہیں۔ دونوں سطحوں (LEVELS) پر اُنہیں علیحدہ علیحدہ پہچاننا چاہیئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں اور آپؐ کے بعد عہدِ خلافتِ راشدہ میں اسلامی انقلاب کو دونوں سطح پر ان قوتوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ کہاں یہ معاملہ کہ حضورؐ

ایک ایک شخص کے لئے دعائیں کیا کرتے تھے کہ اے پروردگار ابوجہل بن ہشام اور عمر بن خطاب میں سے کسی ایک کو تو ایمان کی توفیق دے دے کہاں یہ صورت ہے کہ فوج در فوج قبیلہ در قبیلہ لوگ آرہے ہیں۔ اسلام قبول کر رہے ہیں۔ اُن میں یقیناً مخلصین بھی تھے لیکن ایک قابلِ ذکر تعداد ایسے لوگوں کی بھی تھی جنہوں نے یہ سمجھ کر کہ اب مزاحمت ممکن نہیں ہے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اُن کے ذہن اور فکر میں بنیادی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ چنانچہ ایک روایت میں یہ الفاظ بھی منسوب ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ اس وقت جو لوگ دین میں داخل ہو رہے ہیں فوج در فوج یہ نکلیں گے بھی دین سے فوج در فوج۔ (یخرجون من دین اللہ افواجا) اور اس کی ابتداء بھی حضورؐ کی حیات طیبہ میں ہو گئی تھی۔ جب ۸ھ ہجری میں جنگ موتہ میں مسلمانوں کو زک اُٹھانی پڑی۔ حضرت زیدؓ بن حارثہ، حضرت جعفر طیارؓ اور حضرت عبداللہ ابن رواحہ انصاری جیسے جلیل القدر اصحاب رسول شہید ہو گئے طالع آزما لوگوں نے دیکھا کہ سلطنتِ روما سے بھی محاذ آرائی کا آغاز ہو گیا ہے تو اُنہوں نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کی قوت اتنی ناقابلِ شکست نہیں رہی۔ اب ہم سر اٹھا سکتے ہیں چنانچہ نئے مدعیانِ نبوت حضورؐ کی زندگی میں نمودار ہونا شروع ہو گئے۔ مسیلمہ کذاب اُٹھا اور ایک بڑے علاقے کے لوگ اُس کے پیرو بن گئے وہ بڑی سیاسی قوت بن گیا۔ اُس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغام بھیجا کہ اگر آپؐ ملک عرب کو تقسیم کر لیں اور آدھا ملک مجھے دے دیں تو ہم آپس میں مصالحت کر لیتے ہیں ورنہ معاملہ میدان جنگ میں طے ہو گا۔ حضورؐ نے بایں الفاظِ قرآنی جواب بھجوا دیا کہ

اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ یُوْرِثُھَا	زمین اللہ کی ہے، اپنے بندوں میں
مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ	سے جسے چاہتا ہے اُس کا وارث
(سورۃ الاعراف آیت ۱۲۸)	بنا دیتا ہے۔

اسی طرح طلیحہ ابن اسعدی اور اسود عنسی نے نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ پھر ایک خاتون سجاع نبوت کا دعویٰ لے کر کھڑی ہو گئی اور اُس نے مسیلمہ کذاب سے شادی بھی کر لی۔ گویا ایک جھوٹے نبی اور جھوٹی نبیہ نے متحدہ محاذ بنا لیا۔ ان میں سے بعض نے حضورؐ کی حیاتِ طیبہ میں اور بعض نے آپؐ کے انتقال کے فوراً بعد نبوت کے دعوے کئے۔ اندرونِ

عرب یہ پہلی انقلاب شکن قوت تھی جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے فوراً بعد اپنا کام شروع کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کا مرحلہ یقیناً مسلمانوں کے لئے بہت ہی حوصلہ شکن تھا۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اُس وقت مسلمان کس طرح صدمے سے نڈھال ہوئے ہوں گے اور کس طرح انکی ہمتیں پست ہوئی ہونگی۔ اسی نازک مرحلے پر دوسری انقلاب شکن قوت وہ قبائل عرب تھے جنہوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا۔ انہوں نے کہا ہم مسلمان ہیں مسلمان رہیں گے نماز پڑھیں گے لیکن زکوٰۃ نہیں دیں گے۔ بعض روایات کے مطابق اُنہوں نے زکوٰۃ کا مطلقاً انکار نہیں کیا تھا صرف یہ کہا تھا کہ ہم حکومت کو نہیں دیں گے۔ اپنے طور پر زکوٰۃ کا انتظام کریں گے۔ تیسری قوت مرکز گریز طاقتوں کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ آزادی تو عربوں کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی وہ کسی مرکزی حکومت کے تصوّر سے ہی نا آشنا تھے۔ یہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ تھا کہ آپؐ نے ایک جھگڑالو قوم کو بنیانِ مرصوص بنا کر ایک مرکز کے تابع کر دیا تھا۔ یہ مرکزی حکومت کا قیام بھی آزادی پسند قبائل کے مزاج کے خلاف تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ہم مسلمان ہیں مسلمان رہیں گے لیکن کسی مرکزی حکومت کو تسلیم نہیں کرینگے۔

مقامِ صدیق اکبرؓ

خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بیک وقت ان تینوں انقلاب شکن طاقتوں اور تحریکوں کا مقابلہ کیا اور اِن پر قابو پایا۔ اس مرحلے پر صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے مقام اور مرتبے کو بھی سمجھ لیجئے۔ مقامِ صدیقی مقامِ نبوّت سے بہت قریب ہوتا ہے۔ سورہ نساء میں اللہ تعالےٰ نے اہلِ ایمان کے چار مراتب کا ذکر کرتے ہوئے انبیاء کے بعد دوسرا درجہ صدّیقین کا بیان کیا ہے۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ	جو اللہ اور رسول کی اطاعت کریگا
فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ	وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر
اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ	اللہ نے انعام فرمایا ہے۔ یعنی
وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ	انبیاء اور صدیقین اور شہداء
وَالصّٰلِحِيْنَ ج وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ	اور صالحین۔ کیسے اچھے ہیں یہ رفیق
رَفِيْقًا ط (سورۃ نساء آیت - ۶۹)	جو کسی کو میسّر آئیں۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ جسمانی اعتبار سے دبلے پتلے اور نحیف انسان تھے۔ طبیعت میں شفقت و رحمت اور نرمی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ حضورؐ کی وفات کا صدمہ، خلافت کا بارگراں اور پھر یہ تین عظیم معاملات بیک وقت سامنے آگئے۔ پھر جو تھا بلکہ بنیادی مسئلہ اُس لشکر کی روانگی کا تھا جسے حضورؐ نے حضرت اسامہؓ بن زیدؓ کی سرکردگی میں تیار کروایا تھا لیکن اُس کی روانگی سے پہلے حضورؐ انتقال فرما گئے۔ یہ رومیوں کے خلاف تیسری مہم تھی۔ پہلی بار جنگ موتہ میں مسلمانوں کو بہت نقصان ہوا۔ دوسری بار غزوۂ تبوک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود تشریف لے گئے تو قیصر نے مقابلے سے گریز کیا کیونکہ وہ آپؐ کی نبوت کو پہچان چکا تھا۔ حضورؐ کی وفات کی وجہ سے اس تیسرے لشکر کی روانگی کے مسئلے پر مدینہ میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ اکثر لوگوں کی رائے یہ تھی کہ سردست اس لشکر کو روانہ نہ کیا جائے۔ مدینے کی حفاظت کے لئے روک لیا جائے کیونکہ عملاً مدینہ منورہ، مکہ مکرمہ اور طائف کے سوا کم و بیش باقی عرب باغی ہو گیا تھا۔ اندیشہ تھا کہ کسی وقت بھی قبائل عرب مدینہ پر حملہ کر دیں گے۔ تمام اندیشوں اور خدشات کو مسترد کرتے ہوئے رسولؐ کے جانشین نے لشکر کو حسبِ پروگرام روانہ کیا۔ لشکر کے سردار حضرت اسامہؓ نوجوان ہیں اپنی سواری پر ہیں بوڑھے خلیفۃ المسلمین ابوبکرؓ صدیق اُن کی سواری کے ساتھ دوڑتے ہوئے آخری ہدایات دے رہے ہیں، وہ اترنا چاہتے ہیں لیکن خلیفہ کا حکم ہے کہ سواری سے مت اُترو۔ جو جھنڈا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہارے ہاتھ میں دیا ہے اسے لے کر جاؤ، اور جہاد کرو ——— پھر یہ مشورہ بھی دیا گیا کہ مدعیانِ نبوت سے تو جنگ کی جائے مگر مانعین زکوٰۃ کو سردست نہ چھیڑا جائے۔ کیونکہ انہوں نے اسلام کا انکار نہیں کیا اور مصلحت کا یہ تقاضا بھی تھا کہ بیک وقت کئی محاذ کھولنا نقصان دہ ہوگا۔ لیکن جب ذمہ داری کا وقت آیا تو ثابت ہوا کہ اس نحیف و ناتواں جسم اور بظاہر شفیق و رقیق انسان کے اندر عزم اور ارادے کا کوہ ہمالیہ چھپا ہوا ہے۔ اور فی الحقیقت مقامِ صدیقیت کو جو قرب حاصل ہے مقامِ نبوت سے، یہ اُس کا پرتو تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جس انقلاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا، صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے تمام انقلاب شکن قوتوں اور تحریکوں کی سرکوبی کر کے اُس انقلاب کو مستحکم و مجتمع (CONSOLIDATE) کیا۔

توسیع انقلاب

توسیع انقلاب کا آغاز اور اُس کے خلاف ایران و روم کی عالمی طاقتوں کی طرف سے اعلان جنگ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہؐ میں ہی ہو چکا تھا جبکہ جنگ موتہ اور غزوہ تبوک کی صورت میں رُومیوں سے عملاً ٹکراؤ بھی شروع ہو گیا تھا۔ اور جیش اسامہؓ بھی اُنہی کے خلاف لشکر کشی کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ کیوں کہ شام کے علاقے میں قیصر کے ایک باج گزار شیخ نے حضورؐ کے ایلچی کو شہید کر دیا تھا۔ البتہ ایرانیوں کے خلاف کوئی باقاعدہ فوج کشی حضورؐ کے زمانے میں نہیں ہوئی۔ خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب اندرونی شورشوں سے نمٹنے کے بعد توسیع انقلاب کی طرف توجہ کی تو آپؓ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ایک لشکر تو ملک شام کی طرف روانہ کیا جو سلطنت روم کا باج گزار علاقہ تھا اور ایک لشکر عراق کی طرف بھیجا جو ایران کا باج گزار علاقہ تھا۔ لیکن زندگی نے آپ کو زیادہ مہلت نہ دی۔ سوا دو برس کے مختصر عہد خلافت صدیقی کے بعد جب اعزاز خلافت حضرت عمرؓ کو منتقل ہوا تو تمام اندرونی فتنے ختم ہو چکے تھے اور توسیع انقلاب کا بھرپور آغاز ہو چکا تھا۔ حضرت عمرؓ کے دس سالہ عہد خلافت میں اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے پہلے دس سالوں میں توسیع انقلاب کا عمل بھرپور طریقے سے جاری رہا۔ اس عمل کی نوعیت و کیفیت کا احاطہ کرنے کیلئے ملک عرب، جزیرہ نمائے عرب اور روم و ایران کی سلطنتوں کی وسعت اور ان کا سیاسی و جغرافیائی خاکہ بھی ذہن میں رہنا چاہیئے۔ درحقیقت ملک عرب ایک مثلث نما علاقہ ہے۔ اس کا بڑا حصہ تو جزیرہ نمائے عرب کہلاتا ہے۔ جس کے نیچے جنوب کی طرف بحیرہ عرب ہے اور مشرق میں خلیج فارس دور تک اوپر چلی گئی ہے۔ اسی طرح مغرب میں بحیرہ احمر ہے اور خلیج عقبہ شمال مغرب کی طرف اوپر نکل گئی ہے۔ یوں یہ جزیرہ نما وجود میں آیا ہے کہ اس کے تین اطراف میں سمندر اور ایک طرف خشکی ہے۔ شمال میں خشکی کی طرف شام عرب، عراق عرب اور کردستان کا علاقہ مل کر مثلث کا ایک ضلع بناتے ہیں۔ جزیرہ نمائے عرب کا بیشتر حصہ تو صحراؤں اور پہاڑوں پر مشتمل ہے اس لئے سلطنت روم یا سلطنت فارس میں سے کسی نے اسے اپنا مطیع بنانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ صرف یمن کا علاقہ چونکہ زرخیز تھا اس

لئے وہاں ایران کا گورنر بازان موجود تھا۔ اسی طرح شام اور عراق کے علاقے جو اپنی زرخیزی کی وجہ سے ہلالِ زرخیز (FERTILE CRECENT) بھی کہے جاتے ہیں اپنی دو ہمسایہ عالمی قوتوں ایران و روم کے ساتھ وفاداری و باجگزاری کا تعلق قائم رکھتے تھے۔ عراق کی سرحدیں چونکہ سلطنت ایران سے ملحق تھیں اس لئے یہاں کے شیوخ اور مقامی سردار ایرانی حکومت کی سرپرستی سے قائم رہتے تھے اور شام چونکہ سلطنتِ روما کی سرحد پر واقع تھا اس لئے وہاں کے مقامی عرب سردار اور شیوخ قیصرِ روم کے نامزد اور وفادار ہوتے تھے۔ روم کی بزنطینی سلطنت کے تین بڑے حصے تھے۔ ایک شمالی افریقہ دوسرا مغربی ایشیا یعنی شام اور ایشائے کوچک کا علاقہ اور تیسرا حصہ یورپی علاقے پر مشتمل تھا۔

شہادت عمرؓ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دس سالوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئیوں کے مطابق ایران فتح ہوا۔ کئی ہزار سالہ قدیم شاہی نظام نیست و نابود ہو گیا۔ سراقہؓ بن جعشم کو جنہوں نے سفرِ ہجرت کے دوران قریش کے اعلان کردہ انعام کے لالچ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا تعاقب کیا تھا کسریٰ کے کنگن پہنائے گئے[1] رومی سلطنت میں سے شام اور بیت المقدس کے علاقے اسلامی قلمرو میں شامل ہوئے۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی خلافت کے دسویں برس ایرانی نیشنلزم کے انتقام کا شکار ہو گئے۔ ایرانی شہنشاہیت کے خاتمے کے بعد ایرانی نیشنلزم اور شاہ پرستی کا جذبہ بھی ایک انقلاب شکن قوت کی صورت میں سامنے آیا۔

---

[1] سراقہؓ نے ہجرتِ مدینہ کے دوران حضورؐ کا تعاقب کیا تھا لیکن دوبارا ایسا ہوا کہ جیسے ہی وہ حضورؐ اور حضرت ابوبکرؓ کے قریب پہنچتا تھا اُس کے گھوڑے کی اگلی دونوں ٹانگیں ریت میں دھنس جاتی تھیں۔ چنانچہ وہ تائب ہو کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضورؐ نے مسکرا کر فرمایا کہ سراقہ میں تو تمہارے ہاتھ میں کسریٰ کے کنگن دیکھ رہا ہوں اور یہ پیشین گوئی دورِ خلافت عمرؓ میں پوری ہوئی جب سلطنتِ کسریٰ کی دھجیاں بکھر گئیں اور واقعتہً کسریٰ کے کنگن سراقہ کو پہنائے گئے۔

چونکہ ایران حضرت عمر رضی اللہ عنہ، کے عہد خلافت میں فتح ہوا۔ اس لئے ایرانی قوم پرستوں کو سب سے زیادہ دشمنی حضرت عمرؓ کی ذات سے تھی۔ دوسرے انہوں نے خیال کیا کہ شاید حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کی ہوئی جماعت اور حکومت شاید ایک ہی شخصیت کے بل پر کھڑی ہے۔ حالانکہ یہ ان کی غلط فہمی تھی۔ اسلامی نظام اور اسلامی حکومت ایک فرد کا معاملہ نہیں تھا۔ وہ ایک اجتماعی قوت تھی جس نے انقلاب برپا کیا تھا۔ ابھی وہ نیوکلیس (NUCLEUS) اور وہ مرکزی قوت برقرار تھی۔ یہ وہ جماعت تھی جس کی تربیت خود اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کی تھی اور جن کی شان قرآن میں یوں بیان کی گئی ہے کہ :

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ	وہ مہاجر و انصار جنہوں نے سب سے
الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ	پہلے دعوتِ ایمان پر لبیک کہتے میں
وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ	سبقت کی، نیز وہ جو بعد میں استبازی
بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ	کے ساتھ اُن کے پیچھے چلے، اللہ اُن
وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ	سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی
جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ	ہوتے، اللہ نے اُن کے لئے باغ مہیا
خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ	کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی
الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝	ہوں گی اور وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے۔
(سورۃ التوبۃ آیہ ۱۰۰)	یہی عظیم الشان کامیابی ہے۔

اگر وہ جماعت مضبوط نہ ہوتی تو جزیرہ نمائے عرب میں جتنی بڑی قوتیں اٹھیں وہ اسلام کا تیا پانچہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں اور اسلامی حکومت ختم ہو جاتی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ، کا قاتل ابولولو فیروز حضرت مغیرہؓ ابن شعبہ کا ایرانی النسل غلام تھا اُس نے ایک بار حضرت عمرؓ سے شکایت کی کہ میرے مالک نے مجھ پر بہت زیادہ ٹیکس عائد کر رکھا ہے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ تم کیا کیا فن جانتے ہو۔ جب اُس نے اپنے کام گنوائے تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ اگر تم اتنے ماہر کاریگر ہو تو یہ ٹیکس زیادہ نہیں ہے۔ گویا اُس کی اپیل خارج کر دیں۔ ساتھ ہی حضرت عمرؓ نے کہا کہ سنا ہے تم چکی بہت اچھی بناتے ہو ایک چکی ہمارے لئے بھی بنا دو۔ اُس نے جواب دیا "آپکے

لئے تو میں ایسی چکی بناؤں گا جو قیامت تک پستی رہے گی"۔ حضرت عمرؓ نے اسی وقت کہہ دیا کہ دیکھا یہ شخص مجھے قتل کی دھمکی دے گیا ہے۔ یہاں یہ بات جان لیجئے کہ اسلام کے نظامِ عدل میں امتناعی نظری بندی (PREVENTIVE DETENTION) کا کوئی وجود نہیں۔ جب تک کسی نے جرم نہیں کیا آپ اُسے گرفتار نہیں کر سکتے خلیفہ وقت خود کہہ رہا ہے یہ شخص مجھے قتل کی دھمکی دے گیا ہے۔ پھر یہ بات بھی بالکل واضح تھی کہ اُس کا تعلق ایک ایرانی جرنیل ہرمزان سے تھا۔ اُس نے خلیفۂ اسلام پر جو حملہ کیا وہ قطعاً اُس کا ذاتی فعل نہیں تھا۔ درحقیقت یہ ایرانی سازش تھی۔ ایرانی نیشنل ازم کا انتقام تھا۔ ۲۶ ذی الحج کو نمازِ فجر کے دوران ابولولو فیروز نے زہر میں بجھے ہوئے خنجر سے حضرت عمرؓ پر چھ وار کیئے۔ جب لوگوں نے اُسے پکڑنے کی کوشش کی تو کچھ کو زخمی کر کے اُس نے اُسی خنجر سے خودکشی کر لی۔ حضرت عمرؓ تین دن تک زخمی حالت میں زندہ رہے۔ تیسرے دن آپ کا انتقال ہوا۔ یکم محرم الحرام ۲۴ھ ہجری کو آپ کو دفن کیا گیا۔ حضرت عمرؓ کی شہادت سے یہ بات بہرحال ثابت ہو گئی کہ اسلامی انقلاب کی عمارت اتنی بودی نہیں ہے کہ ایک فرد کے ہٹنے سے ختم ہو جاتے۔

فتنۂ عظیم اور یہود کا کردار

حضرت عمرؓ کی جگہ حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے۔ توسیع انقلابِ محمدی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا عمل پورے زور شور سے جاری رہا۔ مصر، قبرص اور شمالی افریقہ کے علاقے فتح ہوئے۔ قیصرِ روم کی عیسائی سلطنت مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی لیکن اُس کے دو بہت بڑے علاقے اسلام کے زیرنگیں آ گئے۔ صرف ایشیائے کوچک میں ترکی کا علاقہ اور یورپ کا علاقہ باقی رہ گیا۔ کامل دس برس تک خلافتِ عثمانی بھی اسی شان سے قائم رہی جس شان پر حضرت عمرؓ نے اُسے پہنچایا تھا۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے آخری دو سالوں میں اندرونی طور پر ایک نیا فتنہ رونما ہو گیا، جس کو سب سے بڑا فتنہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ ایک مصری مصنف نے ان واقعات پر جو کتاب لکھی ہے اُس کا نام ہی "الفتنۃ الکبریٰ" رکھا ہے۔ یہ بڑا فتنہ کیا تھا۔ اسے سمجھئے۔ جس طرح توسیعِ انقلاب کے نتیجے میں ایرانی سلطنت کا خاتمہ ہوا تھا

اسی طرح جزیرہ نمائے عرب کے اندر انقلابی عمل کے دوران حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بڑی بڑی معاشی اور مذہبی قوت یعنی یہود کو زیر کیا تھا۔ حضورؐ کی حیاتِ طیبہ میں مشرکین کے خاتمے کے ساتھ سب سے بڑی زک یہود کو پہنچی تھی۔ قرآن میں بھی یہود کو مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن کہا گیا ہے۔ مدینہ میں یہود کے تین قبیلے آباد تھے۔ ایک ایک کر کے انہیں وہاں سے جلاوطن کیا گیا۔ بنو قریظہ کو بدعہدی پر یہ سزا دی گئی کہ اُن کے جتنے بھی مرد جنگ کے قابل تھے اُنہیں قتل کر دیا گیا۔ یہ سب سے بڑی سزا تھی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک سے یہودیوں کو ملی۔ مدینہ سے نکل کر جب یہ خیبر میں آباد ہوئے تو وہاں سے بھی انہوں نے مسلمانوں کے خلاف اپنی سازشیں جاری رکھیں۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خیبر پر حملہ کر کے وہاں سے بھی انہیں نکالنا پڑا۔ اب پہچانیئے کہ عرب میں اندرونی طور پر سب سے زیادہ زخم خوردہ قوت یہود کی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں عیسائیوں کے ساتھ تو کوئی مقابلہ ہوا ہی نہیں۔ عیسائیوں میں سے حضرت نجاشی ایمان لے آئے تھے اور اُن کے جانشین کو جب اسلام کی دعوت دی گئی تھی تو اس نے اگرچہ اسلام قبول نہیں کیا تھا لیکن حضورؐ کے نامہ مبارک اور ایلچی کا احترام و اکرام کیا۔ نجران کے عیسائیوں کا وفد بھی حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ جو عیسائی جزیرہ نمائے عرب میں آباد تھے وہ کبھی یہودیوں کی طرح نہ مسلمانوں کے خلاف کسی سازش یا مہم میں شریک ہوئے نہ انہوں نے کسی معاندانہ سرگرمی میں حصہ لیا۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سب سے بڑھ کر انتقام کا جذبہ یہودیوں کے سینوں میں کھول رہا تھا۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ان کے اندر ایک لاوہ پک رہا تھا۔ وہ موقع کے منتظر تھے۔ اُن کی سازشی ذہانت کو تو آج بھی دُنیا مانتی ہے اور اُن کی سازشوں کے تانے بانے کو سمجھنے کے لئے بھی بڑی ذہانت درکار ہوتی ہے۔ وہ بظاہر بڑی معصوم اور بے ضرر قسم کی تنظیمیں قائم کرتے ہیں۔ یہ روٹری انٹرنیشنل ہے یہ لائنز کلب ہے۔ بظاہر ان کے مقاصد بڑے پرکشش اور پاکیزہ ہوتے ہیں۔ اُن کی کشش میں ہمارے بھائی اُن میں شامل ہوتے ہیں۔ وہاں اُنہیں کچھ چودھراہٹیں

ملتی ہیں کچھ دُنیا میں گھومنے پھرنے کے مواقع میسر آتے ہیں اور پھر یہود انکے ذریعے اپنی سازشوں کے جال پھیلاتے ہیں۔ علامہ اقبال نے اپنے وقت میں برطانیہ کے حوالے سے جو بات کہی تھی کہ ہے "فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے" وہ آج امریکہ پر صادق آتی ہے۔ امریکہ میں حال ہی میں کانگریس کے ایک سابق ممبر نے اپنی کتاب " THEY DARE TO SPEAK OUT " میں امریکی سیاست اور معاشرے پر یہود کی گرفت کو بے نقاب کیا ہے۔ مصنف بائیس برس تک کانگریس کا ممبر رہا۔ اسرائیل کے خلاف ایک بیان دینے کی پاداش میں یہودیوں نے اُسے الیکشن میں شکستِ فاش دلوائی۔ لاس اینجلس کی صرف ایک یہودی پارٹی نے اُسکے خلاف تین ملین ڈالر چندہ دیا۔ اُس نے اپنی کتاب میں اُن تمام حربوں کو بے نقاب کیا ہے جن کے ذریعے یہود امریکی سیاست اور معیشت کو کنٹرول رہے ہیں۔ جو شخص اسرائیل کے خلاف بات تک کرنے کی کوشش کرتا ہے اپنے سرمائے اور اپنی سازشوں سے اُس کے سیاسی کیریئر کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ یہ کوئی دور از کار باتیں نہیں۔ آج کی متمدن دنیا کے قائد امریکہ کا ذکر ہے۔

عبداللہ ابن سبا اور شہادتِ عثمانؓ

حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت کے آخری دو برسوں میں ایرانی نیشنلزم کے ساتھ یہودی سازش کا یہ فتنہ بھی ملحق ہو گیا تھا۔ یمن کے ایک یہودی عبداللہ ابن سبا نے اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اس سازش کا آغاز کیا۔ اُس نے مدینے میں رہ کر حالات کا جائزہ لیا۔ اُسے مسلمانوں کا ایک کمزور نقطہ مل گیا۔ قدیم قبائلی عصبیتوں کے جراثیم عرب کے مسلمان معاشرے کی سرشت میں اتنے گہرے اُترے ہوئے تھے کہ ان کے اثرات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں بھی ظاہر ہو جاتے تھے۔ جب کوئی منافق کسی پرانے واقعہ کی یاد تازہ کر دیتا تھا تو اوس اور خزرج کے درمیان تلواریں نکل آتی تھیں۔ یہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وجودِ مبارک تھا جو فتنے کی آگ کو بھڑکنے نہیں دیتا تھا۔ آپؐ کے انتقال کے بعد خوش قسمتی سے پہلے دونوں خلفاء کا تعلق قریش کے دو چھوٹے چھوٹے قبیلوں یعنی بنو تمیم اور بنو عدی سے تھا۔ لیکن حضرتِ عثمان رضی اللہ

عنہ، کا تعلق قریش کے بڑے اور بااثر خاندان بنو امیہ سے تھا جن کی پرانی مسابقت بنو ہاشم کے ساتھ چلی آ رہی تھی۔ یہودی ذہن نے اس دکھتی رگ کو تاڑ لیا تھا۔ مدینہ سے نکل کر سب سے پہلا مورچہ اُس نے بصرہ میں لگایا۔ اپنے ہمخیال لوگوں کی جمعیت پیدا کی اور اُن میں کچھ نئے عقائد پھیلانے شروع کئے۔ مثلاً اس نے کہا کہ کتنی عجیب بات ہے کہ مسلمان حضرت عیسیٰ کے بارے میں تو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں اور دوبارہ دُنیا میں آئیں گے جبکہ اپنے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں سمجھتے ہیں کہ وہ فوت ہو گئے اور زیرِ زمین دفن ہیں۔ حالانکہ وہ بھی زندہ ہیں اور دوبارہ اس دُنیا میں تشریف لائیں گے اس طرح اس نے مسلمانوں کے جذبہ عشقِ رسول کو بھڑکا کر نہ صرف یہ کہ اپنے بارے میں یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی کہ یہ شخص تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مداح، عاشق اور عقیدت مند ہے بلکہ ایک باطل عقیدے کی بنیاد بھی رکھ دی۔ اسی طرح اُس نے دوسرا عقیدہ یہ پیش کیا کہ ہر نبی کا ایک وصی ہوتا ہے اور وہی نبی کا جانشین ہوتا ہے۔ اُس علاوہ کوئی دوسرا جانشین بن جائے تو اُس کی حیثیت غاصب کے سوا کچھ نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی اور جانشین حضرت علی رضی اللہ عنہ، ہیں، خلافت بھی اُنہی کا حق ہے پہلے دونوں خلفاء بھی غاصب تھے اور سب سے بڑا غاصب تو موجودہ خلیفہ ہے۔ یہ تو ابتدائی باتیں تھیں آخر میں اُس نے حضرت علیؓ کے بارے الوہیت کا یہ عقیدہ بھی پیش کیا کہ حضرت علی کو در اصل مظہرِ خدا ہے۔ اللہ اُن کے اندر حلول کر گیا ہے۔ وہی 'GOD INCARNATE' یعنی تجسیم ربّ کا قدیم مشرکانہ عقیدہ اُس نے حضرت علیؓ کے بارے میں پھیلانا شروع کر دیا۔ ان عقائد کے ساتھ اُس نے حضرت عثمان رضؓ کے خلاف سیاسی پروپیگنڈے کی ایک باقاعدہ مہم چلائی کہ وہ کنبہ پرور ہیں، بیت المال میں خیانت کرتے ہیں اور اپنے رشتہ داروں کو نوازتے ہیں وقس علیٰ ھٰذا۔ جب بصرہ کے گورنر ابن عامر نے اُس کی سرگرمیوں کا نوٹس لیا تو وہ وہاں سے کوفہ چلا گیا۔ لیکن اُس کے ہم خیال لوگوں کی ایک معقول تعداد بصرہ میں پیدا ہو چکی تھی جو اُس کے نظریات کو پھیلانے کے لئے کافی تھی۔ کوفہ ایک نیا شہر تھا جسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ، نے ایران کی سرحد پر فوج چھاؤنی

کے طور پر آباد کیا تھا۔ یہاں پر ایرانی نیشنل ازم شاہ پرستی اور یہودی سازش کا ملاپ ہوا۔ کوفہ میں عبداللہ ابن سبا کے نظریات کو خوب پذیرائی ملی۔ بہت لوگ اُس کے پیروکار بن گئے جب کوفہ کے گورنر سعید بن العاص نے اُس سے باز پرس کی تو وہ دمشق پہنچ گیا۔ وہاں حضرت امیر معاویہؓ جیسے زیرک صحابی موجود تھے وہاں اُس کی دال نہیں گلی تو وہاں سے مصر چلا گیا۔ مصر میں اُس نے اپنا اڈہ بنا لیا۔ ہر صوبے میں دوسرے صوبے کے گورنر کے خلاف پروپیگنڈہ اور افواہ سازی کا ایک سلسلہ اُس نے قائم کر کے لوگوں میں ایک عام بے اطمینانی کی فضا پیدا کر دی۔ پروپیگنڈے کی اس شاطرانہ ترتیب کو ذہن میں رکھیئے۔ اُس دور میں ذرائع ابلاغ موجود نہیں، تار نہیں ٹیلیفون نہیں ڈاک کا کوئی لمبا چوڑا انتظام نہیں۔ آج سائنس اور ترقی کے دور میں بھی حال یہ ہے کہ افواہوں کے بل پر کیسے بڑے فتنے پیدا ہو جاتے ہیں اُس دور کے حالات کو قیاس کر لیجیئے۔ افواہ کا ایک اپنا فلسفہ ہوتا ہے۔ انسان کی فطری کمزوری ہے کہ وہ اچھی بات کی نسبت بری بات کو ذرا کان لگا کر سنتا ہے۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب منافقین نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگائی تو اس دور میں جبکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس مسلمانوں کے درمیان موجود تھے، بہت سے مخلص مومنین بھی منافقوں کی اس سازش کا شکار ہو گئے۔ قصہ مختصر یہ کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، کے خلاف عبداللہ ابن سبا کی سازش کامیاب ہو گئی جو حضرات واقعات کی تفصیل جاننا چاہتے ہیں۔ میرے کتابچے "شہید مظلوم" کا مطالعہ کریں۔

پروپیگنڈہ کی مہم کے نتیجے میں مختلف صوبوں سے آئے ہوئے بلوائیوں نے مدینۃ الرسول میں خلیفۃ المسلمین اور امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو انتہائی مظلومیت کے عالم میں شہید کر دیا۔ بلوائیوں نے پچاس روز تک آپؓ کے گھر کا محاصرہ کئے رکھا۔ حضرت عثمانؓ کو اُس کنوئیں کے پانی سے بھی محروم کر دیا جسے عہد رسالت میں انہوں نے خرید کر اہلِ مدینہ کے لئے وقف کر دیا تھا۔ جس طرح حضرت عمرؓ نے اپنے قاتل ابولولو فیروز کے خلاف کوئی امتناعی اقدام نہیں کیا تھا اسی

طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی بلوائیوں کے خلاف کسی قسم کے فوجی اقدام کی ممانعت کر دی۔ انہوں نے کہا کہ میں اپنی جان بچانے کے لئے کسی کلمہ گو کا خون بہانے کو تیار نہیں ہوں۔ حضرتِ عثمانؓ سے کوئی اختلاف کرنا چاہے تو کرے میں تو اسے اُن کی عزیمت کا بہت بڑا ثبوت سمجھتا ہوں۔ ایرانیوں کی نسل پرستانہ ذہنیت اور یہود کی منتقمانہ سازشوں نے مل کر وہ حالات پیدا کئے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت پر منتج ہوئے اور پھر خانہ جنگی اور فتنے کے اُس دور کا آغاز ہوا جس میں قریباً ایک لاکھ مسلمان ایک دوسرے کی تلواروں کا نشانہ بنے۔

شہادت حضرت علی رضؓ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے۔ بدقسمتی سے اُن کا پورا عہدِ خلافت باہمی خانہ جنگی میں گزر گیا۔

حضرت علی رضؓ نے مدینے سے دارالحکومت کوفے منتقل کر دیا۔ کوفہ عبداللہ ابن سبا کے پیروکاروں کا ایک بہت بڑا مرکز تھا۔ وہاں سبائیوں نے حضرت علی رضؓ کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ جب بھی صلح کی نوبت آئی انہوں نے اپنی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے جنگ شروع کروا دی۔ "نہج البلاغہ" میں حضرت علی رضؓ کے خطبات پڑھ لیجئے کہ وہ اپنے ساتھیوں کو کس طرح لعن طعن کرتے ہیں۔ وہ حضرت علی رضؓ کا حکم مانتے ہی نہیں تھے۔ حضرت امیر معاویہ رضؓ حضرت زبیر رضؓ حضرت طلحہ رضؓ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ میں سے کوئی بھی خلافت کا مدعی نہیں تھا۔ سب کا مطالبہ یہی تھا کہ حضرت عثمان رضؓ کے قاتلوں سے قصاص دلوایا جائے۔ جنگِ جمل کے موقع پر حضرت علی رضؓ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کے درمیان صلح ہو رہی تھی، تقریباً بات طے ہو چکی تھی۔ حضرت علی رضؓ نے اعلان کر دیا تھا کہ جو لوگ حضرتِ عثمان رضؓ کے خون میں براہِ راست ملوث ہیں وہ علیحدہ ہو جائیں۔ اُس وقت سبائیوں میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ وہاں اُن کے لیڈر عبداللہ ابنِ سبا اور مالک اشتر نخعی بھی موجود تھے۔ دونوں نے سازش کر کے رات کی تاریکی میں حضرتِ عائشہ رضؓ کے لشکر پر حملہ کر دیا تھا اور افواہ اڑا دی تھی کہ حملہ حضرتِ عائشہ رضؓ کے لشکر کی طرف سے ہوا ہے۔ بہرحال صلح ہوتے ہوتے جنگ چھڑ گئی۔ دونوں طرف سے دس ہزار مسلمان کام آئے۔ اسی طرح ایک موقع پر بو مسلم خولانی حضرت معاویہ

کا تحریری پیغام صلح لے کر آئے۔ حضرت معاویہ رضؓ نے لکھا کہ آپ سے ہمارا کوئی جھگڑا نہیں، آپ کی خلافت سے ہمیں انکار نہیں، ہم بیعت کرنے کو تیار ہیں، آپ صرف قاتلینِ عثمان رضؓ کو ہمارے حوالے کر دیں۔ حضرت علی رضؓ نے جب کوفہ کی جامع مسجد میں حضرت معاویہ رضؓ کے سفیر کی موجودگی میں پیغامِ صلح پڑھ کر سنایا تو دس ہزار مسلح کوفیوں نے کھڑے ہو کر بیک زبان کہا کہ "ہم سب عثمان رضؓ کے قاتل ہیں لو ہم سے بدلہ"۔ حضرت علی رضؓ بے بس ہو گئے۔ بالآخر حضرت علی رضؓ اور حضرت معاویہ رضؓ کے درمیان صفین کے مقام پر شدید جنگ ہوئی۔ دونوں طرف سے چوالیس ہزار مسلمان کام آئے یہ صرف ایک جنگ میں تہ تیغ ہونے والوں کی تعداد ہے ورنہ حضرت علی رضؓ اور حضرت معاویہ رضؓ کے درمیان جنگوں کے سلسلے میں مزید خونریزی بھی ہوئی۔ جنگِ صفین کے دوران جب حضرت علی رضؓ نے ثالثی کی تجویز قبول کر لی تو انہی سبائیوں کا ایک حصہ باغی ہو کر حضرت علی رضؓ کے لشکر سے علیحدہ ہو گیا جو بعد میں خارجی کہلایا۔ خوب جان لیجئے! یہ خارجی کون تھے؟ یہ حضرت علی رضؓ کے لشکر سے نکلے ہوئے سادہ لوح لوگ تھے، سبائی پروپیگنڈے کے زیر اثر تھے۔ جب یہ لوگ آمادہ فساد ہوئے تو حضرت علی رضؓ کو ان سے بھی جنگ کرنا پڑی۔ صرف نہروان کی جنگ میں چار ہزار خارجی قتل ہوئے۔ انہوں نے تحکیم قبول کرنے پر حضرت علی رضؓ حضرت معاویہ رضؓ اور حضرت عمرو بن العاص جیسے برگزیدہ اصحابِ رسولؐ کو کافر، مرتد اور واجب القتل قرار دیا۔ تین خارجیوں نے ایک معاہدے اور منصوبے کے تحت رمضان کی پندرہ تاریخ کو تینوں بزرگوں پر بیک وقت قاتلانہ حملے کیے۔ اللہ کی تقدیر کا فیصلہ ہے۔ حضرت معاویہ رضؓ پر وار اوچھا پڑا۔ معمولی زخم آئے۔ چند روز میں مندمل ہو گئے۔ حضرت عمرو بن العاص رضؓ علیل تھے اُس روز نماز پڑھانے مسجد میں تشریف ہی نہیں لائے۔ اُن کی جگہ جس نے امامت کی، وہ لقمۂ اجل بن گیا۔ لیکن حضرت علی رضؓ کی پیشانی پر ابنِ ملجم کے زہر میں بجھے ہوئے خنجر کا وار کاری ثابت ہوا۔ اب دیکھئے حضرت عثمان رضؓ کے بعد حضرت علی رضؓ بھی سبائیوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔ آخری وقت میں حضرت علی رضؓ سے لوگوں نے پوچھا کہ ہم حضرت حسن رضؓ کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کر لیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بالکل صاف اور درست جواب دیا کہ میں نہ تمہیں اس کا حکم دیتا

ہوں نہ اس سے منع کرتا ہوں۔ اگر تم حسن رضؓ کو خلافت اور کا اہل سمجھتے ہو تو بیعت کرلو۔ لیکن صرف میرا بیٹا ہونے کی وجہ میں یہ نہیں کہتا کہ ضرور اُس کے ہاتھ پر بیعت کرو۔

حضرت حسنؓ کا مصالحانہ کردار اور خانہ جنگی کا اختتام

بہرحال لوگوں نے حضرت حسن رضؓ کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ آپؓ چھ ماہ خلیفہ رہے حضرت معاویہ رضؓ اور حضرت عمرو رضؓ بن العاص نے حضرت علی رضؓ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی نہ حضرت حسن رضؓ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ عالم اسلام متحد نہیں ہوا۔ توسیع انقلاب کا عمل رُک گیا۔ تلواریں اپنے ہی خون سے رنگین ہوتی رہیں۔ حضرت حسن رضؓ حضرت معاویہ رضؓ کے خلاف لشکر لے کر نکلے تو راستے میں افواہ اُڑ گئی کہ حضرت حسن رضؓ کے لشکر کے ہراول دستے کو شکست ہوگئی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت حسن رضؓ کے اپنے ساتھی اُن کی جان کے درپے ہوگئے۔ اُنہیں راستے میں مدائن میں کسریٰ کے ایک پرانے محل میں پناہ لے کر جان بچانی پڑی۔ اُن کے ساتھی کون تھے۔ وہی سبائی وہی کوفی۔ حضرت حسن رضؓ اُن کی حقیقت کو خوب جان گئے تھے۔ اُن کو تجربہ ہوگیا تھا اُن لوگوں کے کردار کا۔ ان حالات میں حضرت حسن رضؓ نے حضرت معاویہ رضؓ کی صلح کی پیش کش کو فوراً قبول کرلیا۔ حضرت حسن رضؓ کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی بھی موجود تھی کہ "میرے اس بیٹے کے ذریعے اللہ ایک وقت میں مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان صلح کرادے گا۔" یہ ۴۱ھ کی بات ہے۔ حضرت معاویہ رضؓ نے حضرت حسن رضؓ کو شرائط صلح طے کرنے کا پورا اختیار دے دیا۔ آج کی اصطلاح میں گویا بلینک چیک (BLANK CHEQUE) دے دیا گیا۔ چنانچہ حضرت حسن رضؓ نے چار شرائط پیش کیں۔ جنہیں حضرت معاویہ رضؓ نے من وعن تسلیم کرلیا۔ پہلی شرط یہ تھی کہ عام معافی ہوگی۔ اب تک دونوں طرف سے جنگوں میں جو کچھ ہوا اس پر کسی سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔ دوسری شرط یہ طے ہوئی کہ ایران کے صوبہ اہواز کا سالانہ خراج حضرت حسن رضؓ کو ملے گا۔ تیسری شرط یہ تھی کہ میرے بھائی حسین رضؓ کو سالانہ ۲۰ ہزار درہم وظیفہ دیا جائے گا۔

چوتھی اور آخری شرط یہ تھی کہ بنی ہاشم کو مسلمانوں کے دوسرے قبائل سے زیادہ وظیفہ دیا جائے گا۔ صلح کے بعد حضرت حسن رضؓ نے اعلان کر دیا کہ اگر خلافت حضرت معاویہ رضؓ کا حق تھی تو انہیں پہنچ گئی اور اگر میرا حق تھی تو میں اُن کے حق میں دستبردار ہو گیا۔ اس اعلان کے بعد حضرت معاویہ رضؓ نے بیعتِ خلافت لی اور اس طرح اُس پانچ سالہ خانہ جنگی کا خاتمہ ہُوا جس میں ایک لاکھ مسلمان ایک دوسرے کے نیزوں اور تلواروں سے قتل ہوئے تھے۔

حضرت معاویہ رضؓ کا عہدِ حکومت

آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس صلح پر یہودیوں اور سبائیوں کی متحدہ انقلاب شکن تحریک کو کس قدر صدمہ پہنچا ہو گا۔ تاریخ کی یہ عجیب حقیقت سامنے آتی ہے کہ ۴۱ھ سے ۶۰ھ تک حضرت معاویہ رضؓ کے بیس سالہ عہدِ حکومت میں کوئی خانہ جنگی، کوئی بغاوت، کوئی فتنہ و فساد، کوئی اختلاف رونما نہ ہُوا۔ تاریخِ اسلام میں خلافتِ راشدہ کے تیس سالہ دَور کے بعد یہ بیس سالہ دَور بھی مسلمانوں کا بہترین دور تھا۔ توسیع انقلاب کا جو عمل اندرونی سازشوں، خلفشار، خانہ جنگی اور فتنہ و فساد کے نتیجے میں بالکل رُک گیا تھا، پھر سے اُس کا آغاز ہُوا۔ گویا ع "ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا"، مسلمان پھر سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر نکل کھڑے ہوئے۔ قیصر کا دارالسلطنت قسطنطنیہ جو ابھی تک فتح نہیں ہُوا تھا، اُس پر فوج کشی کی گئی۔ جس کے بارے میں صحیح بخاری کی روایت میں یہ بشارت موجود ہے کہ اس جہاد میں شامل ہونے والے "مغفورٌ لہم" ہیں۔ اس لشکر میں حضرتِ حسین رضؓ بھی شامل تھے۔ میزبانِ رسولؐ حضرت ابوایوب انصاری رضؓ نے اسی روایت کا مصداق بننے کے لیے ۹۰ سال کی عمر میں پالکی میں سوار ہو کر اتنا طویل سفر کیا۔ وہاں آپ رضؓ کا انتقال ہُوا۔ آپ رضؓ نے وصیت کی کہ مجھے دشمن کے علاقے میں شہر پناہ کے جتنے قریب دفن کر سکتے ہو کرنا۔ آج بھی قسطنطنیہ میں اُن کی قبر موجود ہے۔ اس لشکر کا سپہ سالار کون تھا؟ البدایہ والنہایہ میں حافظ ابن کثیر کی نقل کردہ روایت دیکھ لیجئے۔ اس لشکر کا سپہ سالار حضرت معاویہ رضؓ کا بیٹا یزید تھا۔ بہرحال حضرت معاویہ رضؓ

کا بیس سالہ عہد فتنہ پروروں اور سازشیوں کے لیے سخت نامساعد عہد تھا۔ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لگائے ہوئے جس پودے کو جڑ سے اُکھاڑنے کے لیے سازشیں کر رہے تھے۔ وہ پھل پھول رہا تھا۔ ملک میں امن و امان تھا۔ مملکت کی سرحدیں وسیع ہو رہی تھیں۔ اس بیس سالہ دور میں ایک اختلافی معاملہ یعنی آیا یزید کی ولی عہدی کا۔ میرا خیال تھا کہ آج یہ بحث مکمل ہو جائے گی۔ لیکن اس نکتے پر اسے چھوڑتے ہیں۔ انشاء اللہ باقی گفتگو اگلے جمعہ کو ہو گی۔

اقول قولی ھٰذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

ٹیلی ویژن پر نشر شدہ دروس کا سلسلہ (درس ۱۱)

مباحث عمل صالح

بندۂ مومن کی شخصیت کے خدوخال

(سورۃ الفرقان کے آخری رکوع کی روشنی میں)

ڈاکٹر اسرار احمد

(۱)

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

"بہت ہی بابرکت ہے وہ ہستی جس نے آسمان میں بُرج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور روشن چاند بنایا۔ اور وہی ہے کہ جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے تعاقب میں لگا دیا اس میں نشانیاں ہیں ہر اُس شخص کے لئے جو یاد دہانی اخذ کرنا چاہے یا شکر کی روش اختیار کرنا چاہے۔ اور رحمان کے محبوب بندے تو وہ ہیں جو زمین پر چلتے ہیں تواضع اور نرمی کے ساتھ اور جب ان سے جاہل لوگ اُلجھتے ہیں تو وہ سلام کہہ کر علیحدہ ہو جاتے ہیں اور وہ جو راتیں بسر کرتے ہیں اپنے ربّ کے حضور میں سجدہ کرتے ہوئے اور دست بستہ کھڑے رہ کر۔ اور وہ جو یہ کہتے ہیں ۔ اے ربّ ہمارے! پھیر دے ہم سے جہنم کے عذاب کو۔ یقیناً اس کا عذاب چمٹ جانے والی چیز ہے۔ یقیناً وہ بہت بُری جگہ ہے مستقل جائے قرار ہونے کے اعتبار سے بھی اور عارضی قیام گاہ کے اعتبار سے بھی ۔ اور وہ

جو جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی سے کام لیتے ہیں نہ بخل سے۔ بلکہ انکی روش اس کے بین بین ہوتی ہے اور وہ جو نہیں پکارتے اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو اور نہ قتل کرتے ہیں کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے مگر حق کے ساتھ۔ اور نہ زنا کرتے ہیں اور جو کوئی بھی یہ کرے گا وہ اس کی پاداش بھگت کر رہے گا۔ دُگنا کر دیا جائے گا اس کے لئے عذاب کو قیامت کے دن اور وہ اس میں رہے گا ہمیشہ ہمیش ذلیل و خوار ہو کر۔ سوائے اس کے جو توبہ کرے اور ایمان لائے اور اچھے عمل کرے۔ تو ایسے لوگوں کی برائیوں کو اللہ تعالےٰ بھلائیوں سے بدل دے گا۔ اور اللہ تو ہے ہی بخشنے والا، رحم فرمانے والا۔ اور جو توبہ کرتا ہے اور نیک عمل کرتا ہے تو حقیقتاً وہی ہے جو ایسی توبہ کرتا ہے جیسے کہ توبہ کرنے کا حق ہے۔ اور وہ جو جھوٹ پر اپنی موجودگی تک گوارہ نہیں کرتے اور اگر کسی لغو کام کے پاس سے اُن کا اتفاقاً گزر ہو جائے تو بھی دامن کو بچاتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ اور وہ جنہیں جب ان کے ربّ کی آیات کے ذریعہ نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اس پر اندھے اور بہرے ہو کر نہیں ٹوٹ پڑتے۔ اور وہ جو یہ کہتے ہیں کہ اے ربّ ہمارے! ہمیں اپنی بیویوں اور اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں اپنے نیک بندوں کے آگے چلنے والا بنا۔ یہ ہیں وہ لوگ جنہیں بدلہ میں بالاخانے ملیں گے بعوض اس صبر کے جو انہوں نے کیا اور وہاں ان کا استقبال ہوگا نیک دُعاؤں اور سلام کے ساتھ۔ وہ اُس میں رہیں گے ہمیشہ ہمیش۔ اور وہ بہت ہی عمدہ جگہ ہے۔ مستقل جائے قرار ہونے کی حیثیت سے بھی اور عارضی قیام گاہ ہونے کے اعتبار سے بھی۔ اے نبی! کہہ دیجئے! میرے رب کو تمہاری کوئی پرواہ نہیں ہے اگر نہ ہوتا تمہیں پکارنا تو تم نے جھٹلا دیا ہے تو اب یہ جھوٹ جلد تم پر لاگو ہو کر رہے گا۔"

محترم سامعین اور معزز ناظرین! السلام علیکم۔

ابھی آپ نے سورۃ الفرقان کے آخری رکوع کی آیات کی تلاوت بھی سماعت فرمائی اور ان کی ترجمانی بھی سنی۔ مطالعہ قرآن حکیم کے جس منتخب نصاب کا سلسلہ

درس ان مجالس میں ہو رہا ہے۔ ان آیات پر اس کا درس ۱۲ مشتمل ہے ۔ اور اگر مضامین کی ترتیب کو بھی آپ ذہن میں تازہ کر لیں تو آپ کو یاد ہو گا کہ اس منتخب نصاب کے پہلے حصہ میں چار جامع اسباق تھے ۔ دوسرے حصہ میں کچھ ایسے مقامات تھے جن کے ذریعہ ایمان کے ضمن میں چند مباحث ہمارے سامنے آئے تھے ۔ تیسرے حصہ میں اعمال صالحہ کی بحث ہے جو چل رہی ہے ۔ اس کے پہلے سبق میں اُن اوصاف کا بیان تھا ۔ جو ازروئے قرآن حکیم انسان کی سیرت کی تعمیر یا بقول علامہ اقبال مرحوم تعمیر خودی کے لئے بنیادی لوازم ہیں ، اساسات ہیں ۔ اب آج کے درس میں جو آیات مبارکہ آپ نے سماعت فرمائیں اور اس کی جو ترجمانی آپ کے سامنے آئی اس میں آپ نے محسوس فرما لیا ہو گا کہ یہاں بھی چند اوصاف ہیں کہ جن کا ذکر ہو رہا ہے ۔ جس طرح سُورۂ مومنون کے پہلے رکوع میں چھ مرتبہ اسم موصولہ " اَلَّذِیْنَ " دہرا دہرا کر آیا تھا اور سورۂ معارج کی اُن آیات میں کہ جو سورۂ مومنون کی آیات کی ہم مضمون تھیں آٹھ مرتبہ " اَلَّذِیْنَ " کی تکرار ہوئی ۔ اسی طرح آج کے درس میں بھی آپ نے دیکھا کہ " اَلَّذِیْنَ " ایک مرتبہ آیا اور " وَالَّذِیْنَ " سات مرتبہ دُہرایا گیا ۔ کہ عباد الرحمٰن یعنی ہمارے محبوب بندوں میں یہ اور یہ اوصاف ہوتے ہیں ۔ ان کی یہ اور یہ کیفیت ہوتی ہے ۔ ان کی راتیں اس میں اور اس کیفیت میں بسر ہوتی ہیں ۔ وہ جب خرچ کرتے ہیں تو ان کی روش یہ ہوتی ہے۔ وغیرہم ۔

غور طلب بات یہ ہے کہ اُس ورا س سبق کے مابین منطقی ربط کیا ہے! آپ نے محسوس کر لیا ہو گا کہ اس مقام پر اُن اوصاف کا بیان ہو رہا ہے کہ جنہیں ہم چوٹی کے اوصاف کہہ سکتے ہیں ۔ یعنی ایک پوری طرح تربیت یافتہ خودی یا ایک پوری طرح تعمیر شدہ شخصیت کے یہ خدو خال ہونے چاہئیں ۔ ایک بندۂ مومن کے جو نمایاں اوصاف اللہ کو پسند ہیں ، ان کا اس سبق میں نہایت جامع بیان آیا ہے ۔ میں اسے ایک مثال سے واضح کروں تو وہ یہ ہو گی کہ جیسے ہم ایک عمارت بناتے ہیں تو اس کا ایک STRUCTURE (ڈھانچہ) ہوتا ہے ، جس میں آپ کو معلوم ہے کہ آجکل سیمنٹ ، لوہا ، سریا اور لکڑی وغیرہ استعمال ہوتی ہے ۔ اور عمارت کی اصل مضبوطی ، اس کا اصل استحکام اس کے STRUC-TURE کی مضبوطی پر ہوتا ہے ۔ پھر اس عمارت کی FINISHING ہے ۔ اس کی آراستگی

ہے۔ عمدہ پلاسٹر ہو، رنگ و روغن اعلےٰ ہوا اور اس عمارت کے خدّوخال کی خوبصورتی مختلف پہلوؤں سے ظاہر ہو رہی ہو تو یہ اس اسٹرکچر (عمارت) کے FINISHING TOUCHES ہیں۔ اب ظاہر بات ہے کہ جب آپ کسی عمارت کو دیکھتے ہیں تو اس کا اسٹرکچر (STRUCTURE) نگاہوں کے سامنے نہیں آتا۔ وہ تو ایک مخفی شے ہے، اوجھل شے ہے سامنے جو چیز آئے گی وہ اس کے نمایاں خدّوخال ہیں۔ اگر عمارت دل آویز ہے، خوبصورت ہے، پلاسٹر اچھا ہوا ہے، رنگ و روغن عمدہ ہے تو وہ دیدہ زیب ہوگی اور آپ کی نگاہوں کو اپنی طرف کھینچے گی۔

بالکل یہی ربط و تعلق ہے ہمارے سابقہ سبق میں اور اس سبق میں۔ یوں سمجھئے کہ سیرت و شخصیت کی تعمیر کا جو اساسی پروگرام ہے وہ تو وہ ہے جس پر ہم دو مقامات کے حوالے سے غور کر چکے ہیں۔ لیکن ایک مکمل تعمیر شدہ انسانی شخصیت میں جس کی تعبیر علامہ اقبال مرحوم نے یوں کی ہے کہ ؎

کہتے ہیں فرشتے کہ دل آویز ہے مومن

یہ دل آویزی جن اوصاف سے پیدا ہوتی ہے وہ ہیں جنہیں اللہ تعالےٰ نے اس مقام پر نہایت جامعیت کے ساتھ بیان فرما دیا ہے۔ ہم اس سبق پر بھی کئی حصّوں میں غور کریں گے جیسے پہلے اسباق پر کرتے رہے ہیں۔ اس کا سب سے پہلا حصہ جو دو آیات پر مشتمل ہے، واقعہ یہ ہے کہ ایمان کے ضمن میں جو بحثیں اس سے قبل اس سلسلۂ دروس میں ہو چکی ہیں، ان کا نہایت جامع خلاصہ اس حصہ میں آگیا ہے۔ فرمایا:

تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ۝

"بڑی ہی بابرکت ہے وہ ہستی، وہ ذات جس نے آسمانوں میں بُرج بنائے اور اس (آسمان) میں ایک چراغ روشن کیا۔ یعنی سورج۔ اور روشن چاند بنایا۔"

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً۔

"اور وہی تو ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے تعاقب میں لگا دیا" گویا وہ ایک دوسرے کا پیچھا کر رہے ہیں۔ رات دن کا پیچھا کرتی ہوئی چلی آتی ہے

اور دن جیسے رات کا تعاقب کرتے ہوئے نمودار ہوتا ہے۔ یہ قانونِ طبعی کی ایک بیّن حقیقت ہے اس کے متعلق آپ کو یاد ہوگا کہ اسے سورہ آل عمران کے آخری رکوع میں آیاتِ الٰہیہ سے تعبیر کیا گیا تھا: اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ — اور اس موقع پر ہم نے سورہ بقرہ کے اکیسویں رکوع کی پہلی آیت (آیت نمبر ۱۶۴) بھی تفصیل سے پڑھی تھی کہ اس کائنات کی ہر شے ایک نشانی ہے جس کو دیکھ کر لامحالہ ایک سلیم الفطرت اور سلیم العقل انسان کا ذہن اس کے خالق، اس کے مالک، اس کے صانع، اس کے مصوّر کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اور اس کائنات کے مشاہدات سے اس ذات کی صفاتِ کمال کا اندازہ ہوتا ہے کہ جو اس کائنات کا بنانے والا ہے وہ جو عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ہے۔ اللہ کی قدرت میں کہیں کوئی کمی نہیں، اللہ کے علم میں کہیں کوئی کمی نہیں اسکی حکمت میں کہیں کوئی کمی نہیں۔ وہ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ہے اور وہ ہستی اَلْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ہے۔

یہ درحقیقت وہی مضمون ہے جسے یہاں بھی تمہید کے طور پر بیان کیا گیا ہے کہ جو لوگ ان آیاتِ آفاقیہ پر غور و تدبّر کرتے ہیں، جسے علامہ اقبال نے اس طرح تعبیر کیا کہ ؎

کھول آنکھ زمیں دیکھ، فلک دیکھ فضا دیکھ
مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

تو وہ لوگ جو اس وسیع و عریض کائنات میں پھیلی ہوئی آیات سے اُس کے خالق کی معرفت حاصل کرتے ہیں، انہی میں تو یہ اوصاف پیدا ہوں گے کہ جن کا ذکر آگے آرہا ہے چنانچہ دوسری آیت کے آخر میں فرمایا:

لِمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّکَّرَ اَوْ اَرَادَ شُکُوْرًا

"(یہ نشانیاں ہیں) اُس کے لئے جو چاہے تو یاد دہانی حاصل کرے یا چاہے تو (اللہ کا) شکر گزار بنے"

سورہ لقمان کے دوسرے رکوع کا جو مضمون تھا وہ ان الفاظِ مبارکہ سے آپ کے ذہن میں آگیا ہوگا کہ کائنات کے مشاہدہ سے جہاں تذکّر حاصل ہوتا ہے، یاد دہانی نصیب ہوتی ہے، ذہن اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے وہاں ساتھ ہی اللہ کی نعمتوں کا احساس پیدا ہوتا ہے

اللہ کے احسانات کا ادراک حاصل ہوتا ہے کہ اللہ نے انسان کی روزی کی فراہمی کے لئے کیا عظیم الشان نظام بنایا ہے! اس نے انسان کی ہر ہر ضرورت کو بہم رسانی کے لئے کیا اعلیٰ انتظام و انصرام فرمایا ہے! وہ انسان کے جسم و جان کے تمام تقاضوں کو کس کس طریقہ سے پورا فرما رہا ہے — اس شعور و ادراک سے ایک دوسرا جذبہ انسان کے دل میں ابھرتا ہے وہ جذبۂ شکر ہے یاد آئی ہوگی سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کی پہلی آیت: وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ — "ہم نے لقمان کو حکمت اور دانائی عطا فرمائی کہ کر شکر اللہ کا!" —

تو معلوم ہوا کہ اس کائنات کے مشاہدہ سے اور آیاتِ سماوی، آیاتِ ارضی، آیاتِ آفاقی، آیات انفسی سے ایک سلیم الفطرت اور سلیم العقل انسان کو دو چیزیں اخذ کرنی چاہئیں - ایک وہ جسے قرآن کریم تذکر سے تعبیر کرتا ہے یعنی اس کائنات کی وسعتوں میں انسان کی نگاہیں الجھ کر نہ رہ جائیں بلکہ ان کو دیکھ کر ان پر غور و تدبر سے اس کا خالق، اس کا مالک، اس کا صانع، اس کا مصوّر، اس کا مدبّر یاد آجائے اور ذہن و شعور اور عقل و ادراک اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف متوجہ ہو جائے - جیسے علامہ اقبال نے کہا ہے ؎

گاہ مری نگاہ تیز چیر گئی دلِ وجود
گاہ الجھ کے رہ گئی میرے تخیلات میں

تو دل کی آنکھ سے اس کائنات کے ذریعے اللہ تک پہنچا جائے تو اس کا نام تذکر ہے — اور دوسرے یہ کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ادراک ہو - اس کے احسانات کا شعور ہو - جس کے لازمی نتیجہ کے طور پر اس کے دل میں تشکر کے جذبات وجود میں آئیں - ان دونوں کے لئے یہاں فرمایا گیا: لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ۝

تو یہ ہے مضمون اس رکوع کی پہلی دو آیات کا - آج اسی پر اکتفا کیجئے - اب آئندہ نشست میں ان شاء اللہ اُن اوصاف کا سلسلہ وار بیان ہوگا جو اس تذکر اور تشکر کے نتیجہ میں ایک سلیم الفطرت انسان کی شخصیت کے اندر پیدا ہوتے ہیں - اب اگر آج کی اس گفتگو پر کوئی سوال ہو تو میں اس کے لئے حاضر ہوں -

سوال وجواب

سوال: ڈاکٹر صاحب! ان آیات کے شروع میں برجوں کا جو ذکر آیا ہے تو اس بات کی تشریح فرمائیے کہ ان بُرجوں کی نوعیت کیا ہے؟ اور آسمانوں میں یہ کس قسم کے بُرج ہیں؟۔

ڈاکٹر صاحب: یہ بڑا متعلق سوال ہے۔ اصل میں عربی زبان میں بُرج کہتے ہیں کسی نمایاں چیز کو۔ بُرج کے معنی ہیں کوئی چیز ظاہر ہوئی، نمایاں ہوئی اسی سے لفظ بُرج بنا ہے۔ بُرج اور خاص طور پر برجیوں کے لفظ سے ہم واقف ہیں۔ قلعوں کی فصیل پر جو بُرجیاں بنتی تھیں ان کو برجیاں اسی لئے کہا جاتا تھا کہ وہ دُور تک نمایاں طور پر نظر آتی تھیں۔ اب رہا یہ سوال کہ آسمان میں وہ کون سی شے ہے جسے قرآن مجید بُرج سے تعبیر کر رہا ہے! تو یہ بھی عین ممکن ہے۔ کہ اس سے بڑے بڑے ستارے اور سیارے مُراد ہوں لیکن اس کا حتمی تعین کرنا فی الحال مشکل ہے۔ شاید ہمارا فلکیات کا علم اور آگے بڑھے تو یہ بات نمایاں ہو کر سامنے آئے کہ یہ ہے وہ حقیقت جسے قرآن مجید نے بُرج سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن تا حال مناسب یہ ہے کہ ہم اس بات کو مجمل رکھیں اور آئندہ کے اکتشافات کے امکانات کے لئے کھلا OPEN چھوڑ دیں۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! زیر درس آیات میں دن اور رات کے تسلسل کا ذکر آیا ہے۔ کیا آپ بیان کریں گے کہ اس تسلسل میں کیا حکمت ہے۔؟

ڈاکٹر صاحب: اصل میں لفظ تسلسل آپ صحیح استعمال نہیں کر رہے۔ یہاں لفظ آیا ہے: "خِلْفَۃً"۔ خلف کہتے ہیں بیٹھ کو اور پیچھے کو۔ تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ رات اور دن ایک دوسرے کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ جیسے کہ وہ ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے ہیں۔ رات کے بعد دن، اور دن کے بعد رات۔ اس میں جو حکمتیں ہیں وہ تو اظہر من الشمس ہیں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ ہمارے اس کرّہ ارضی پر حیات کا جو نظام ہے اس میں رات دن کے اس الٹ پھیر اور اس کے فرق و اختلاف کو بڑی بنیادی اور اساسی اہمیت حاصل ہے۔ اس لئے کہ حیات کی جو ابتدائی شکل ہے۔ یعنی عالم نباتات۔ اس کا جو تنفس (RESPIRATION) کا نظام ہے، وہ دن کو کچھ اور ہوتا ہے

اور رات کو کچھ اور ہوتا ہے۔ دن میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کے استعمال سے PHOTOSYNTHESIS (شعاعی ترکیب) کا عمل ہے جو ان پتوں میں ہو رہا ہے۔ اور رات کو یہی پتے آکسیجن جذب کرتے ہیں اور کاربن ڈائی اکسائڈ خارج کرتے ہیں — اور آپ کو معلوم ہوگا کہ اسی پر سارا دار و مدار ہے اس حیاتِ نباتاتی کا — پھر حیوانات کی حیات کا جو سلسلہ ہے، وہ درحقیقت منحصر ہے اسی نباتاتی حیات پر چونکہ یہی نباتات حیوانات کی غذا بنتے ہیں۔ اس پہلو سے غور کرنے والوں کے لئے رات اور دن کے اس الٹ پھیر میں اللہ تعالےٰ کی حکمت کے دفتر پنہاں ہیں۔ ؎

برگِ درختانِ سبز درنظرِ ہوشیار
ہر ورق دفتریست زمعرفتِ کردگار

تو ایک ایک پتہ اگر اللہ تعالےٰ کی معرفت کا دفتر ہے اور ان پتوں میں PHOTOSYN-THESIS کی جو فیکٹری لگی ہوئی ہے — تو اس کا سارا دار و مدار رات دن کے اس الٹ پھیر اور فرق پر ہے۔

حضرات! آج ہم اپنے اس گیارہویں درس کا ایک تو بحیثیت مجموعی طرف جائزہ لے سکیں ہیں اور ابتدائی دو آیات جن کی اس مقام پر حیثیت صرف تمہید کی ہے۔ آج کی نشست میں صرف ان تک ہمارا مطالعہ آگے بڑھ سکا ہے۔ اب ان شاءَ اللہ اگلی نشست میں ہم ان صفات کا سلسلہ وار مطالعہ کریں گے جو اللہ تعالےٰ کو پسند ہیں اور جن کے متعلق وہ چاہتا ہے کہ اس کے محبوب بندوں میں پیدا ہوں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ط

نشر القرآن کیسٹ سیریز
۲۶
مارڈل ٹاؤن لاہور

دین کے انتہائی اہم اور بنیادی موضوع

حقیقتِ ایمان پر ڈاکٹر اسرار احمد

کے ایک ایک گھنٹے کے چار لیکچرز جو ۶۰-سی کے چار کیسٹوں میں دستیاب ہیں
ہدیہ پاکستانی کیسٹ -/۶۰ روپے (جاپانی کیسٹ) -/۱۲۰ روپے مع محصول ڈاک

تفصیل ... عنوانات پر مشتمل ... طبع شدہ موجود ہے خط لکھ کر طلب فرمائیں

انٹرویو

اسد اللہ بھٹو بتاتے ہیں :

بابُ الاسلام سندھ مسائل اور اُن کا حل

تحریر و گفتگو : مقبول الرحیم مفتی

نامور دانشور اور تنظیم فکر و نظر سندھ کے صدر پروفیسر اسد اللہ بھٹو سندھ کی تاریخ اور موجودہ حالات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ موصوف علمی اور ادبی محاذ پر بڑی جانفشانی سے کمیونسٹ، لادین اور علیحدگی پسند قوتوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی خصوصی دعوت پر پروفیسر صاحب لاہور تشریف لائے تھے، انہوں نے قرآن اکیڈمی کی جامع مسجد میں سندھ کی تاریخ اور موجودہ حالات پر سیر حاصل خطاب کیا۔ لیکن شدید بارش کی وجہ سے اہلِ لاہور اُس سے بھرپور انداز میں مستفید نہ ہو سکے۔ سندھ کے مسائل پر اُن کا فکر انگیز انٹرویو پیشِ خدمت ہے۔ اسد اللہ بھٹو صاحب نے صرف مسائل کی نشاندہی پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اُن کا حل بھی بتایا ہے۔

(ادارہ)

س : پروفیسر صاحب! سندھ میں علمی اور ادبی محاذ پر آپ دین کے حوالے سے جو قابلِ قدر خدمات سرانجام دے رہے ہیں ان پر کچھ روشنی ڈالنا پسند فرمائیں گے!

ج : اس میدان میں ہم نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز ۱۹۶۵ء میں جیکب آباد میں حلقہ ادب اسلامی سے کیا تھا۔ مجھے اس حلقے کا صدر منتخب کیا گیا۔ اس میدان میں منظم انداز سے کام کرنے کی ضرورت تو بڑے عرصے سے محسوس ہو رہی تھی کیونکہ لادین قوتیں بڑے پیمانے پر ایک طویل عرصے سے اس میدان میں سرگرم عمل تھیں۔ پھر ۱۹۶۸ء میں باقاعدہ طور پر ایک ادارہ قائم کیا گیا۔ محمد بن قاسم سندھی مسلم سوسائٹی کے نام سے سکھر میں اس کی تشکیل ہوئی۔ میں اس کا نائب صدر منتخب ہوا۔ فکری اور نظریاتی محاذ

پر اس ادارے نے پھر جم کر کام کیا۔ سندھ کے حالات کا تجزیہ پیش کیا دین کے حوالے سے جس خلاء کو محسوس کیا جا رہا تھا اس خلاء کو پُر کرنے کی کوشش کی۔ اس ادارے نے یوم باب الاسلام منانے کی روایت ڈالی۔ اس روایت کو مستحکم کیا اور سندھ کے تمام بڑے بڑے شہروں قصبوں اور دیہات تک اس تحریک کو پھیلا دیا۔ وہ جو ایک تاثر وہ بٹھا رہے تھے۔ داہر پرستی کا تاثر، اس کو ہم نے زائل کیا۔ اگرچہ ہماری کتابیں کم تھیں مگر بہت مؤثر ثابت ہوئیں اور ان کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ لادین عناصر کو اپنی حکمت عملی تبدیل کرنا پڑی۔ دوسرا اہم معاملہ یہ تھا کہ سرکاری ادارے بھی کمیونزم، لادینیت اور علیحدگی پسندی کی فکر کو ہوا دے رہے تھے۔ ہمارے ادارے نے ان کا تعاقب بھی کیا، ان کو بے نقاب بھی کیا۔ حکومت کو بھی متوجہ کیا اور حکومت کو بتایا کہ سندھ کی خدمت تو یہ ہے کہ سندھ کی حقیقی تاریخ سامنے لائی جائے اور جو اس کا حقیقی تشخص ہے کہ اس نے تحریک پاکستان میں قیادت کی ہے امامت کی ہے ہر مرحلے پر، اسے اجاگر کریں، اپنے اداروں کو درست کریں۔ جس کے نتیجے میں سرکاری اداروں میں کچھ تبدیلیاں ہوئیں۔ ان کی حکمت عملی بھی تبدیل ہوئی۔ میں اس ادارے میں تقریباً آٹھ سال تک رہا۔ اس نے کافی کام کیا ہے۔ سندھی زبان میں تیس کے قریب کتابیں شائع کیں۔ بڑے بڑے علمی اجتماعات اور خاص طور پر سیرت کانفرنسیں منعقد کیں۔ سندھ کے محب اسلام ادیبوں اور دانشوروں کو منظم کیا۔ بڑے بڑے عام جلسے بھی کئے، تعلیمی میدان میں بھی نفوذ کیا اور وہ جو یک طرفہ ٹریفک چل رہا تھا اس کو ختم کیا۔ پھر کچھ ایسے اسباب ہوئے کہ اس ادارے سے مجھے کنارہ کش ہونا پڑا۔ پھر ۱۹۷۹ء میں تنظیم فکر و نظر سندھ کے نام سے ادارہ بنایا گیا سکھر میں۔ جس کا میں بانی صدر منتخب ہوا۔ اس ادارے نے پھر اس تحریک کو آگے بڑھایا اور مثبت بنیادوں پر ایک قیمتی اور زرخیز لٹریچر اس ادارے نے تیار کیا ہے۔ اس میں زیادہ تر سندھی کتابیں ہیں، اور پھر یہ کہ بڑی بڑی ادبی اور تعلیمی کانفرنسیں کی ہیں ہم نے۔

س: سندھ میں لادینیت کی علیحدگی کی جس تحریک کا آپ مقابلہ کر رہے ہیں اس کے پیدا ہونے کے اسباب کیا ہیں آپ کی نظر میں۔

ج: یہ جو تحریک ہے لادینیت کی یہ یونہی نہیں بڑھ رہی۔ اس کے لئے ISSUES واقعی موجود ہیں۔ دینی نقطہ نظر سے بھی مسائل کو حل نہیں کیا گیا۔ زیادتیاں سندھ کے لوگوں کے ساتھ ہوئی ہیں۔ زمینیں بھی حق و انصاف کی بنیاد پر لوگوں کو نہیں دی گئیں۔ مگر اس میں پنجاب کے لوگوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اصل میں ہماری بیوروکریسی جو اسلام سے بیگانہ تھی، اس کے ذہن میں لادینیت تھی جو افسرشاہی سندھ میں آئی اس نے یہ نہیں سوچا کہ ہمارے رویے کا کیا اثر پڑے گا۔ خاص طور پر ملازمتوں کے حوالے سے۔ مثال کے طور پر سندھ میں ایسو فرٹیلائزرز کا کارخانہ ہے مگر اس میں پچانوے فیصد ملازمین غیر سندھی ہیں۔ ہمارے افسران معمولی معمولی ملازمین بھی مثلاً چوکیدار ہے چپڑاسی ہیں کلرک ہیں ڈرائیور ہیں وہ بھی

پنجاب سے منگاتے ہیں۔ حالانکہ مقامی طور پر لوگ موجود ہیں ان کو روزگار دیا جا سکتا ہے اور پھر ہمارے توجہ دلانے پر انہوں نے کچھ لوگوں کو ملازمتیں دیں۔ لیکن یہ کہ ایک عجیب ذہنیت ہے۔ خدا جانے ان کا کیا مقصد ہے کہ جان بوجھ کر ایسا کر رہے ہیں یا عصبیت کی وجہ ہے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ غالباً ان کا ذہن صاف نہیں ہے اور حالات کو وہ سمجھ نہیں پاتے کہ ان کے رویّے کے کیا نتائج نکلیں گے۔ بہرحال اس بات کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ ایک ادارہ سندھ میں قائم ہو رہا ہے اور اس میں مقامی طور پر یہ لوگ میسّر ہو سکتے ہیں اور اب تو سائنس میں انجینئرنگ میں ڈاکٹری میں ٹیکنالوجی میں لوگوں کے پاس ڈگریاں ہیں۔ لیکن پھر بھی اداروں میں مقامی لوگوں کا تناسب کہیں دس فیصد ہے کہیں پانچ فیصد ہے۔ اس بات کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ہم سمجھتے ہیں کہ یہ زیادتی ہے۔ اسلام میں بھی اس کا کوئی جواز نہیں۔ تو یہ چیزیں ایسی ہیں کہ جن کا حل ہونا چاہیئے۔ ورنہ یہ ISSUES ان لوگوں کو ملیں گے اور وہ ان کو اٹھائیں گے لیکن سچی بات یہ ہے وہ لوگ حقیقت میں سندھ کے بھی خیر خواہ نہیں ہیں۔ وہ تو کمیونسٹ اور ہندو دلالی کے ایجنٹ ہیں اور ان ISSUES پر ان مسائل کی بنیاد پر وہ انتقام لے رہے ہیں پاکستان سے اور اسلام میں سے۔ بے روزگاری نے سندھ میں بہت سنگین مسئلے کی صورت اختیار کر لی ہے۔ ترجیحی بنیادوں پر اس مسئلے کو حل کیا جانا چاہیئے۔ ہزاروں لوگ بے روزگار ہیں اور اس میں مہاجر بھی شامل ہیں، اس لئے کہ مہاجروں کی کوئی اور سرزمین نہیں ہے۔ ان کو سندھ میں جینا ہے سندھ میں مرنا ہے۔ ان کے مسائل بھی حل ہونے چاہیئے۔ لیکن یہ ہے کہ اب یہ بات طے ہونی چاہیئے کہ ہم نے ساتھ رہنا ہے اور بھائی بن کر رہنا ہے اور بنیاد جو ہے بھائی چارے کی وہ دین ہے اور ملت ہے۔ جس قدر یہ بنیاد کمزور ہوگی ملی رشتہ کمزور ہوگا اسی لحاظ سے عصبیت بڑھے گی اور کوئی بھی چین سے نہیں رہے گا نہ سندھی چین سے رہیں گے نہ مہاجر چین سے رہیں گے۔

س : پروفیسر صاحب بات پھر وہی سیاست کی آجاتی ہے۔ کیا آپ کی دانست میں یہ بیروزگاری اور ملازمتوں کے مسائل اور بیوروکریسی کے رویّے جیسے مسائل ملک کے مجموعی اور عمومی سیاسی مسئلے کو حل کئے بغیر ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ سندھ کا معاملہ تو خصوصی اہمیت رکھتا ہے کہ جیسی کچھ بھی جمہوریت ملک میں آئی ہے۔ اس کے باوجود سندھ کا گورنر وہی ہے جو مارشل لاء کے عہد میں تھا اور وزیر اعلیٰ بھی ایک طرح سے غیر منتخب شخص ہے کہ ان کو وزیر اعلیٰ نامزد کرنے کے بعد "بلا مقابلہ" طریقے سے صوبائی اسمبلی میں پہنچایا گیا ہے۔ ؟

ج : اصل میں خرابی اور بگاڑ کے دو پہلو ہیں۔ چونکہ ہمارے ملک میں جمہوری ادارے شروع سے غیر مستحکم رہے ہیں اور پھر سیاست اور جمہوریت اسلام کے تابع بھی نہیں رہی۔ اس کا مزاج بھی لادینی رہا

اس لئے ان معاملات کو بھی صحیح رُخ پر ڈالنے کی کافی ضرورت ہے لیکن موجودہ صورت حال میں جہاں تک میں سمجھتا ہوں لوگوں نے الیکشن میں حصّہ لیا ہے اور جو لوگ منتخب ہو کر آئے ہیں ان کو واقعتاً عوام نے ووٹ دیئے ہیں۔ اب یہ الگ بات ہے کہ انتخاب کا نظام ہی غلط ہے۔ اس میں دھاندلیاں ہیں۔ دولت کا ناجائز استعمال ہے اور سرمایہ تو بے دریغ ہی استعمال ہوا ہے۔ لیکن یہ فرق ضرور ہوا ہے کہ وزیر اعظم سندھ سے لیا گیا ہے اور وہ بہرحال ایک منتخب نمائندہ ہے۔ اسمبلیاں وجود میں آگئی ہیں یہ ایک ابتدار ہے۔ ان اداروں نے مناسب انداز سے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ ان کو کام کا موقع دیا جانا چاہیئے۔ لیکن مسائل کا اتنا ڈھیر ہے کہ ان سے بھی آسانی سے یہ مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ اس کے لئے ترجیحی اور ہنگامی بنیادوں پر کام کیا جائے۔ کوئی اعلیٰ سطحی کمیشن قائم کیا جائے جو چیف جسٹس کی سربراہی میں قائم ہو اور حقائق کی بنیاد پر پورے مسئلے کا جائزہ لے۔ جو صحیح نمائندے ہیں جنہوں نے نظریاتی سطح پر کام کیا ہے جو مسئلے کی تہ تک گئے ہیں جو مسئلے کے مضمرات جانتے ہیں اس کی تاریخ کو جانتے ہیں تجزیہ کر سکتے ہیں ان سے رائے لی جائے۔ دنیا میں کوئی چیز انہونی نہیں ہے۔ مسئلے کا حل نکل سکتا ہے۔ لیکن اس کی کوئی بنیاد ہونی چاہیئے۔

س : ملک میں جمہوری عمل شروع ہونے کے بعد سندھ میں گورنر اور وزیر اعلیٰ کے حوالے سے کچھ منفی اثرات آپ محسوس کرتے ہیں؟

ج : چونکہ باقی صوبوں کے گورنروں کا تعلق اپنے اپنے صوبے سے ہے اس لئے جو بات آپ کہہ رہے ہیں اس حوالے سے بھی لوگ بات تو کرتے ہیں لیکن جو ممبران اسمبلی ہیں اور جو کابینہ ہے اور وزیر اعلیٰ ہیں ان کی آپس میں گاڑی چل رہی ہے۔ لیکن لوگ اس پہلو سے بہرحال رائے زنی کرتے ہیں۔

س : اس اعتبار سے حکومت نے خود ایک ISSUE دیا ہے ان کے ہاتھ میں۔

ج : ہاں! لیکن اتنا بڑا ISSUE بھی نہیں ہے یہ۔ اس لئے کہ اگر کوئی اور گورنر آئے گا بھی تو اصل مسئلہ حل نہیں ہوگا ایک فرد کی تبدیلی سے۔ اصل تو ذہن کی بات ہے۔ نظریئے کی بات ہے۔ اگر آدمی منصف اور عادل نہیں ہے تو کسی کو لے آئیں حالات جوں کے توں برقرار رہیں گے۔ البتہ کسی سندھی کو گورنر بنانے سے یہ سٹنٹ (STUNT) کی بات ختم ہو جائے گی۔ اب وزیر اعظم لیا گیا ہے سندھ سے پھر بھی لوگ مطمئن نہیں ہیں۔ حالانکہ یہ ایک بڑی چیز ہے۔ سندھ کو نمائندگی ملی ہے۔ یہ ایک اچھا فیصلہ ہے۔ سندھیوں کا احساس محرومی دور کرنے کی ایک شکل ہے۔ میں وزیر اعظم کو جانتا ہوں وہ ایک شریف آدمی ہے ملک سے بھی محبت رکھنے والا ہے اسلام سے بھی محبت رکھنے والا ہے۔ پھر بھی لوگ تو یہی کہتے ہیں کہ کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا۔ وجہ یہ ہے کہ مسائل بہت زیادہ ہیں۔ اندرونی مسائل بھی ہیں اور خارجی مسائل بھی ہیں۔

س : سندھ کے حالات بگڑنے کا سلسلہ کب سے شروع ہوا ہے اور اس کی بنیادی وجوہات کیا ہیں ؟

ج : یہ تقریباً ۱۹۵۵ء تک تو حالات کی سنگینی اور نزاکت کا احساس نہیں ہوا لیکن ۱۹۵۵ء کے بعد سے مسائل اور ان کا احساس دونوں ہی بڑھتے چلے گئے۔ اصل میں تقسیم ہند کے بعد ابتدائی سالوں میں نظریے کا جذبہ دین کا جذبہ غالب تھا۔ لوگوں نے خدمات کی تھیں۔ قربانیاں دی تھیں۔ ایک جذباتی کیفیت قائم تھی، مقامی لوگوں نے انصار کی حیثیت میں، ہجرت کر کے آنے والوں کا بھرپور خیر مقدم کیا تھا۔ انگریز سے نجات ملی تھی۔ ہندو سے نجات ملی تھی لیکن جب مطلع صاف ہوا تو مسائل سامنے آئے بغیر سوچے سمجھے ون یونٹ کو مسلط کیا گیا تو لوگوں کو پھر یاد آگئی وہ کیفیت انگریز کے دور کی جب سندھ صوبہ نہیں تھا بلکہ بمبئی کے ساتھ شامل تھا۔ چھوٹے چھوٹے مسائل کے لیے لوگوں کو لاہور آنا پڑا۔ صوبے کا صدر مقام دور ہونے کی وجہ سے غریبوں کی مشکلات میں اضافہ ہوا۔ مقامی طور پر چھوٹا آدمی بھی اپنے کام کے لیے کوئی نہ کوئی وسیلہ نکال لیتا ہے لیکن اتنی دور آنا اور پھر یہاں آکر وسیلہ اور اپروچ ڈھونڈنا عام آدمی کے لیے بہت مشکل تھا اور پھر اصل بات یہ ہے کہ دونوں طرف دینی و ملی جذبہ نہیں تھا۔ صرف مسائل کی بات تھی۔ مسائل کی بات تو یہ ہے کہ ایک ہی باپ کے دو بیٹوں میں دو سگے بھائیوں میں کہیں تھوڑی سی زیادتی ہو جائے تو بڑے بڑے جھگڑے ہو جاتے ہیں۔ یہاں تو نہ دین کی رُو سے معاشی سطح پر انصاف ہوا، نہ ہی وسائل کو ترقی دینے کے لیے کوئی سنجیدہ کوشش کی گئی اور پھر سیاسی طور پر ایسا نظام مسلط کیا گیا جس میں لوگ حقوق سے محروم تھے۔ ایسے حالات میں عصبیتوں کا ابھرنا بالکل فطری بات تھی، مسائل اپنی جگہ تھے، مسائل کو ہوا دینے والی تحریک بھی موجود تھی جب انہیں بہت بڑا issue مل گیا تو انہوں نے خوب استعمال کیا۔

س : ملک کے دیگر حصّوں کی طرح سندھ میں بھی کچھ مذہبی اور دینی جماعتیں کام کر رہی ہیں موجودہ حالات میں بحیثیت مجموعی ان کا کیا کردار ہے اور کیا اثرات ہیں ؟

ج : سندھ کی صورت حال بڑی گھمبیر ہے اور مسائل بہت پیچیدہ ہیں۔ اکثر دینی جماعتوں نے مسائل سے اپنا دامن بچا رکھا ہے۔ مثلاً جماعت اسلامی بھی مسائل کی پیچیدگی کی وجہ سے خاصی کنارہ کش ہے جس کی وجہ سے اس کے اثر و نفوذ میں اضافے کی بجائے پہلے کی نسبت کچھ کمی آئی ہے۔ باقی جمعیت علماء اسلام فضل الرحمٰن گروپ کا بہت پرانا نظام ہے اور ان کے بہت پرانے مدارس ہیں۔ موجودہ صورت حال میں مسائل کی حد تک انہوں نے الحاد و لادینی کی تحریک کی ہمنوائی کی ہے۔ نظریاتی طور پر ملحدانہ افکار و نظریات کے مقابلے میں انہیں جو کردار ادا کرنا چاہیے تھا۔ اس کے لیے انہوں نے کوئی سنجیدہ اور مبنی بر حکمت منصوبہ بندی کے ساتھ کوئی کام نہیں کیا ہے۔ حالانکہ اگر وہ یہ ذمہ داری پوری کرتے تو وہ بہت مؤثر ثابت ہوتے کیونکہ ان کا بڑا اثر و رسوخ ہے ان کے بے شمار

مدارس ہیں۔ علمائے کرام ہیں۔ مساجد ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے ہاں بھی مستثنیات ہیں۔ ان کے ہاں بھی اللہ کا خوف رکھنے والے اور صورتحال کا احساس رکھنے والے لوگ موجود ہیں۔ وہ اپنی سی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ قرآن وسنت کی تعلیم دیتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر ایک مربوط اور مبنی برحکمت سکیم ہوتی، کوئی لٹریچر کا پروگرام ہوتا، نوجوانوں سے رابطے کا کوئی پروگرام ہوتا تو وہ صورت حال کو سنبھال لیتے۔ لیکن اس کے برعکس یہ بھی ہوا ہے کہ ان میں سے کچھ علماء کی بھد رویاں کھل کر اور عملاً اس تحریک کے ساتھ ہیں۔ انہوں نے کئی لحاظ سے تقویت پہنچائی ہے اس تحریک کو۔ باقی رہی جمعیت علمائے پاکستان تو اس کا دائرہ صرف بڑے شہروں تک محدود ہے۔ سکھر حیدرآباد کراچی وغیرہ۔ اندرون سندھ ان کے تعلقات ہیں لیکن اثرات نہیں ہیں۔ انہوں نے بھی عوام کے مسائل سے کوئی زیادہ واسطہ نہیں رکھا۔

س : یہ بات خاص طور پر محسوس کی جاتی ہے کہ جس استحصالی طبقے نے یہ مسائل پیدا کئے ہیں اور ہمیشہ برسر اقتدار بھی رہتا ہے وہ تو اپنا کام مسلسل کر رہا ہے جبکہ جو دینی قوتیں لادینی تحریک کا مقابلہ کر رہی ہیں ان کے پاس مسائل کو حل کرنے کی کوئی قوت نہیں ہے لیکن جب وہ دینی تحریکیں دین کا نام لے کر لادینی تحریک کے مقابلے پر آتی ہیں تو وہ اس استحصالی طبقے کے ساتھ بریکٹ ہو جاتی ہیں کیونکہ یہ طبقہ بھی دین کا نام تو ضرور لیتا ہے جس لادینی اور ملحدانہ تحریک کو مزید تقویت ملتی ہے۔ اس الجھن کا کوئی حل بھی آپ نے سوچا ہے۔؟

ج : مجھے آپ کے تجزیے سے تھوڑا سا اختلاف ہے۔ اس لئے کہ جہاں تک ہماری تنظیم کا تعلق ہے۔ "تنظیم فکر و نظر سندھ" کا۔ ہم نے پوری صورتحال کا جائزہ لیا ہے۔ مسائل کا تجزیہ کیا ہے۔ مسئلے کی جو ہمہ گیر نوعیت ہے اس پر بحیثیت مجموعی ہم نے بہت غور و فکر کیا ہے۔ ہم نے اپنی حیثیت کے مطابق پورے مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہماری یہی حیثیت ہے کہ ہم حکمرانوں کو بتائیں کہ یہ زیادتی ہو رہی ہیں۔ یا یہ کہ انصاف کے مطابق یوں نہیں یوں ہونا چاہیئے۔ ملازمتوں کے سلسلے میں، سندھی زبان کی ترقی کے سلسلے میں، روزگار کے سلسلے میں، زرعی زمینوں کی تقسیم کے سلسلے میں۔ ہم نے باقاعدہ ان مسائل پر نہ صرف یہ کہ مشورے دیئے ہیں تجاویز دی ہیں۔ بلکہ پریس کے ذریعے بھی ہم نے مسائل کو اٹھایا ہے۔ خط۔ استقبالیہ جو ہم نے دیئے ہیں ان میں ہم نے برسر عام بات کی ہے۔ ہمیں کچھ کامیابی بھی ہوئی ہے۔ ہماری کوششیں نتیجہ خیز ثابت ہوئی ہیں۔ ہمارا نظریاتی تشخص قائم ہوا ہے۔ دین کے حوالے سے، قرآن وسنت کے حوالے سے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا اصل سرمایہ ہمارا ایمان ہے۔ یہ سب سے بڑی دولت ہے اگر یہ دولت ہم نوجوانوں کو دینے میں کامیاب ہو گئے تو باقی سب چیزوں کی حیثیت ثانوی ہو جائے گی۔ لیکن چونکہ اسلام کا مرکزی نقطہ عدل ہے، ہر معاملے میں عدل، اس لئے ہم نے اسلام کے اس تقاضے کو پیش نظر رکھا ہے۔ بڑے جامع پیپرز ہم نے تیار کئے ہیں مسائل پر،

اور صوبائی حکومت کو پیش کئے ہیں۔ مرکزی حکومت کو پیش کئے ہیں ان کو مسئلہ سمجھانے کی کوشش کی ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری کوششوں کے نتیجے میں مرکزی حکومت کو مسئلے کی سنگینی کا احساس ہوا ہے۔ کچھ اقدامات ہوئے ہیں انتخابات کے بعد مرکزی حکومت میں سندھ کو اتنی بڑی نمائندگی دی گئی ہے۔ روزگار کے معاملے میں کوششیں ہو رہی ہیں۔ اندرون سندھ کے دیہی علاقے کے نوجوانوں کے لئے کوٹہ مخصوص کیا گیا ہے کراچی یونیورسٹی میں لطیف چیئر قائم کی جارہی ہے مرکزی حکومت نے ہمارا یہ مطالبہ مان لیا ہے کہ "تنظیم فکر ونظر" کے تحت "سندھ اسلامک سنٹر" قائم کیا جائے۔ ان چیزوں کو ہم اپنا حق سمجھتے ہیں اور حکومت نے یہ کام کر کے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ ہم اس کی تحسین کرتے ہیں۔ حکومت جو تعاون کر رہی ہے اس کا اعتراف کرنا ہم اپنا اخلاقی فرض سمجھتے ہیں۔

س : تعلیمی میدان میں سندھ کی کیا پوزیشن ہے۔ تقسیم ملک کے وقت جو حالات تھے اُن سے موازنہ کیا جائے تو کیا صورت بنتی ہے۔

ج : اللہ کا فضل ہے۔ تقسیم ملک کے وقت کی پوزیشن سے موجودہ حالات کی کوئی نسبت بنتی ہی نہیں۔ اب تو ہر ضلع میں درجنوں اسکول اور کالج ہیں۔ یونیورسٹیاں بن گئی ہیں۔ اللہ کے فضل سے تعلیمی میدان میں تعداد کے لحاظ سے بہت ترقی ہوئی ہے۔ لیکن تعلیم کا معیار بہت پست ہو گیا ہے۔ ایک صحیح نظامِ تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے اور معاشرے کی اخلاقی پستی اور اخلاقی اقدار سے محرومی کے سبب استاد کا تقدس بڑی حد تک مجروح ہوا ہے۔ مسائل کے ہجوم نے تعلیمی ماحول میں کشیدگی اور نفرت بھر دی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ طلباء محنت سے جی چراتے ہیں۔ تعلیم کا ماحول ہی باقی نہیں رہا۔ بڑے بڑے تعلیمی ادارے اور یونیورسٹیاں اکثر بند رہتی ہیں۔ تعلیمی اداروں کی فضا پر سیاست کا غلبہ ہے۔ نقل نے وبائی صورت اختیار کر لی ہے۔ طلباء نقل کو اپنا حق سمجھنے لگے ہیں۔ بہت ہی تشویشناک صورتِ حال ہے۔

س : سندھ کے وڈیروں کے بارے میں متضاد باتیں سننے میں آتی ہیں۔ ایک گروہ کی رائے میں وڈیرہ سندھ کے دیہی معاشرے کی ایک ضرورت ہے۔ کچھ لوگ اُسے ایک استحصالی طبقہ گردانتے ہیں۔ اس بارے میں آپ کا کیا تجزیہ اور مطالعہ ہے۔

ج : وڈیرہ وہی ہے جس نے تحریک پاکستان میں حصہ لیا۔ تحریکِ پاکستان میں اس طبقے کی بڑی خدمات ہیں۔ جمالی خاندان ہے، جتوئی خاندان ہے۔ اس طرح کے اور کئی خاندان ہیں۔ خود جی ایم سید جو بعد میں منفی رُخ پر چلے گئے، تحریک پاکستان میں انہوں نے ایک مثبت کردار ادا کیا تھا۔ حاجی عبداللہ ہارون نے بہت مالی خدمت کی تحریک پاکستان کی۔ کچھ ایسی بات نہیں ہے کہ اس ساری صورتِ حال کے ذمہ دار یہ زمیندار اور وڈیرے ہوں۔ اس طبقے میں بھی اچھے برے دونوں قسم کے لوگ موجود ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ زمینداری نظام اپنی جگہ قائم ہے۔ اصل خرابی نظام میں ہے۔ بیوروکریسی اور زمیندار مِل جل کر حکمتِ عملی بناتے ہیں۔ جو جتنا بڑا زمیندار ہے معاشرے پر اُس کی گرفت

اتنی ہی مضبوط ہے - اندرون سندھ زمیندار کے بغیر کسی کا الیکشن میں کامیاب ہونا یا سیاست میں کوئی مقام حاصل کرنا ممکن نہیں - کسی غریب آدمی کے لئے یہ بہت مشکل ہے - اسلامی قوتوں کی پیش قدمی کو بھی زمیندار پسند نہیں کرتا - یہی وجہ ہے کہ اسلامی قوتوں کو الیکشن کے میدان میں کوئی قابل ذکر کامیابی حاصل نہیں ہو سکی -

س - اُس کے سیاسی پس منظر اور سیاسی کردار سے قطع نظر وہ معاشرے میں ایک استحصالی قوت تو ہے -

ج - اس استحصالی کردار کے نعرے کا بھی ایک خاص پس منظر ہے - اصل میں اگر اُس کا ذاتی کردار اچھا ہے تو وہ استحصال نہیں کرتا - اب بھی بہت سے زمیندار مدارس کی خدمت کر رہے ہیں تعلیمی ادارے بنا رہے ہیں - علماء کی خدمت کرتے ہیں علماء کے ساتھ تعاون کرتے ہیں -

س : علماء کی خدمت تو کرتا ہے لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کاشتکار جو اُس کے لئے اپنی محنت اپنا خون پسینہ صرف کرتا ہے - اُس کا حق وہ دیتا ہے یا نہیں -

ج : حق تو وہ دیتے ہیں - ایسی صورت تو نہیں ہے کہ کاشتکار کو اُس کے حصے سے محروم کر دیا جائے - اب تو صورت یہ ہے کہ زمیندار ڈر رہا ہے کاشتکار سے - اس لئے کہ جو فضا بنی ہے - گزشتہ پندرہ بیس برس میں اور جو زبان ملی ہے لوگوں کو اس سے تو زمیندار ڈرنے لگا ہے - ایک بات ہے کہ کچھ زمینداروں کی تو میتیں ہیں وہ اپنی قوم کے سردار ہیں - اگر کوئی بڑی قوم کا سردار ہے تو اُس کو چیلنج کرنا بڑا مشکل ہے - لیکن درمیانے درجے کے زمیندار اور چھوٹے درجے کے زمیندار کے مقابلے میں ہاری اتنے زور آور ہو گئے ہیں اور اپنے حقوق کے لئے بیدار ہو گئے ہیں کہ زمیندار خوف زدہ ہو گیا ہے - لیکن ہاری اپنے مسائل کے لئے محتاج ہوتے ہیں زمینداروں کے - اپنے خاندانی جھگڑوں کے لئے آپس کے دنگا فساد کے لئے، تحصیل مقدمے کے معاملات میں اُنہیں زمیندار کے تعاون کی ضرورت پڑتی ہے - اور اس میں بھی زیادہ تر تعلق محبت کا ہی ہوتا ہے - کیونکہ دونوں ایک دوسرے کے محتاج ہیں - اس لئے انکی گاڑی چل رہی ہے -

س : دراصل یہ جاگیردار طبقہ صدیوں سے اقتدار اور حکومت کا ایک ستون بنا ہوا ہے - حکومت انگریز ہو یا آزادی کے بعد کسی جماعت کی ہو یا فوج کی ان کا رابطہ اقتدار کے ساتھ قائم رہتا ہے - اس چیز نے انہیں ایک استحصالی طبقہ بنا دیا ہے -

ج : یہ بات تو صدیوں سے چلی آ رہی ہے - لیکن اب اس میں ایک تبدیلی آئی ہے - ماضی قریب میں کئی زمیندار حکومت کے مقابلے پر آئے ہیں - زمینداروں اور پیروں نے حکومت کو چیلنج کیا ہے - جلوسوں کی قیادت کی ہے - جیلوں میں گئے ہیں - یہ وہ باتیں ہیں جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا - یہ ایک نئی چیز سامنے آئی ہے -

س : یہ بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ "سندھی اپنی گوٹھ سے نہیں نکلتا" یہ ایک نان مارشل قوم ہے۔ اس تاثر کی حقیقت کیا ہے؟

ج : سندھ ایک ایسا خطہ ہے جہاں روزگار کے وسائل اتنے زیادہ ہیں اور زمین اتنی زرخیز ہے کہ ایک سندھی باہر جانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا۔ البتہ ایسی بات نہیں ہے کہ وہ نکلنے کے بالکل تیار ہی نہیں اور اس تاثر کا بھی ایک پس منظر ہے کہ سندھی نان مارشل ہیں یا فوج میں بھرتی نہیں ہوتے۔ وہ پس منظر یہ ہے کہ انگریز نے سندھ پر بزور قوت قبضہ کیا۔ بہت زبردست جنگ اور خونریز معرکے کے بعد انگریز کامیاب ہوا۔ اب انگریز کو خدشہ تھا کہ اگر سندھیوں کو فوج میں بھرتی کیا گیا تو بازی پلٹ بھی سکتی ہے اس لیے اس نے نہ صرف یہ کہ سندھیوں کو فوج میں بھرتی نہیں کیا بلکہ اس بات کو بھی عام کیا کہ جناب سندھی تو گھر سے نہیں نکلتا اور لڑنا نہیں جانتا اور فوجی زندگی نہیں اختیار کر سکتا۔ یہ سب باتیں انگریز کی اس پالیسی کا نتیجہ ہیں۔ ورنہ سندھیوں نے ۱۸۴۷ء سے لے کر ۱۹۳۶ء تک سیاسی جدوجہد کی۔ پیر صاحب پگاڑا نے جو عملی جہاد کیا وہ بھی تحریک آزادی کا ایک زریں باب ہے۔ اس میں بھی انگریز کے ساتھ خونریز معرکے ہوئے انگریز کو بڑی پریشانی ہوتی۔ فوجی ایکشن کے ساتھ پیر صاحب کے مکانات پر بمباری ہوئی لیکن ان لوگوں نے آخر تک ہتھیار نہیں ڈالے۔ حروں نے برطانیہ کی پارلیمنٹ میں خطوط بھیجے کہ ہم آخر وقت آپ کے سامنے جھکیں گے نہیں۔ جب تک ہماری جان میں جان ہے ہم لڑیں گے۔ یہ تو ماضی قریب کی بات ہے۔ کیا یہ ان کے مارشل مزاج کی دلیل نہیں ہے۔ دراصل انگریز نے جان بوجھ کر سندھیوں کو پیچھے رکھا تھا۔

س : اب اس تاثر کو دور کرنے کی عملی صورت کیا ہو سکتی ہے۔

ج : یہ کام تو قیام پاکستان کے فوراً بعد ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن اب صورت یہ ہے کہ سب سے پہلے تو لوگوں کا اعتماد بحال کیا جائے۔ لوگوں کی جائز شکایات دور کی جائیں۔ سندھ میں رہنے والے تمام لوگوں کی شکایات دور کی جائیں۔ اس کے ساتھ ساتھ پٹارو کی طرح کسی بہتر مقام پر نئی ملٹری اکیڈمی بنائی جائے۔ فوجی چھاؤنی قائم کی جائے۔ پھر لوگوں کو فوج میں بھرتی کرنے کے لئے مہم چلائی جائے۔ دیہاتوں میں لوگوں سے ملاقاتیں کی جائیں۔ کچہریاں منعقد کی جائیں، اخبارات کے ذریعے لوگوں کو بتایا جائے۔ پریس کو ریڈیو کو ٹیلیویژن کو استعمال کیا جائے، زمینداروں سے ملا جائے۔ زمینداروں کی اور فوجی افسروں اور والدین کی کمیٹیاں بنائی جائیں۔ جو نوجوانوں کو ترغیب دیں کہ فوج میں جانا جہاد کرنا، آپ کے دین کا تقاضا ہے آپ کی شاندار روایات کا حصہ ہے، باعزت کام ہے، روزگار کے مسئلے کا حل ہے۔ اس طرح سے ایک فضا بنائی جائے

تو لوگ فوج میں ضرور آئیں گے۔

س ۔ سیاسی سطح پر تو سیاسی لوگوں نے نئے اور پرانے سندھیوں کی الگ الگ تنظیمیں بنا رکھی ہیں مختلف محاذ بنے ہوتے ہیں۔ لیکن اس کشمکش کا عوام کی زندگی پر کیا اثر ہے۔ لوگوں کے جذبات ایک دوسرے کے بارے میں کیسے ہیں؟

ج : چونکہ اس ملک میں ملت اور دین کے تقاضوں کے مطابق لوگوں کی تعلیم اور تربیت نہیں ہوئی۔ اسلامی اخوت اور بھائی چارے کو قائم نہیں کیا گیا۔ اس لیے بلاشبہ لوگ اس زاویے سے بھی سوچتے ہیں۔ اور بڑے بڑے ٹکراؤ اور تصادم بھی ہوئے ہیں۔ مثلاً ۱۹۷۲ء کے لسانی ہنگامے ہیں۔ ان لسانی فسادات نے جذبات میں بڑی شدت پیدا کی۔ کمیونسٹ عناصر نے دونوں طبقوں میں گھس کر کشمکش کی فضا پیدا کی۔ آج تک اُس کے اثرات باقی ہیں۔ ان محاذوں اور تنظیموں نے بڑا نقصان پہنچایا۔ لیکن اس وقت مہاجروں اور سندھیوں میں نئی سوچ یہ پیدا ہوئی ہے کہ اصل زیادتی تو پنجاب کی طرف سے ہوئی ہے۔ آپ نے اخبارات میں بھی پڑھا ہوگا کہ انتہا پسند سندھیوں اور انتہا پسند مہاجروں کے کئی اجلاس ہوئے اور وہ کیفیت جو تھی ٹکراؤ کی اُس میں کمی آگئی ہے اگرچہ یہ بات دین کے حوالے سے ہوتی تو ہمیں خوشی ہوتی۔ اب چونکہ مادی مفادات مشترک ہوگئے ہیں اور یہ بھی معلوم ہوگیا ہے کہ دونوں کو یہیں رہنا ہے۔ مہاجر کہتے ہیں کہ ہم جو کچھ کمائیں گے یہیں رہے گا۔ لیکن پنجاب کے لوگ تو یہاں سے کما کر وہاں بھیجتے ہیں۔ اسی لئے کراچی میں بڑی کشیدہ فضا ہے بہرحال اس پہلو سے وہ فضا تبدیل ہوئی ہے وہ کشیدگی کم ہوئی جو لسانی فسادات کے نتیجے میں پیدا ہوئی تھی۔ اب مہاجر اور سندھی پنجابیوں کے خلاف آپس میں مذاکرات اور اتحاد کی باتیں کر رہے ہیں۔ زرعی زمینوں کا مسئلہ بہت بنیادی ہے۔ مہاجر کہتے ہیں کہ ہمارا تو حق ہے کہ ہم اپنا سب کچھ وہاں چھوڑ آئے لیکن۔ پنجاب کے لوگوں اور خاص طور پر سابق فوجی افسران اور سول بیوروکریسی کو جو بڑے پیمانے پر زمینیں دی گئی ہیں۔ مثلاً یہ آغا شاہی فارم ہیں اور یہ ائر مارشل اصغر خاں کی زمینیں ہیں۔ گدو بیراج میں تو ان لوگوں کے گاؤں کے گاؤں ہیں۔ جنہیں ان لوگوں نے سرکاری وسائل سے ترقی دی ہے۔ یہ حقائق ہیں لوگوں کو نظر آتے ہیں۔ پہلے ایک عرصے تک یہ چیزیں چھپی رہیں لیکن اب تحریکوں کی وجہ سے ایک احساس ابھرا ہے لوگوں میں شعور پیدا ہوا ہے۔ محب وطن لوگ جانتے ہیں کہ یہ بڑا گھمبیر مسئلہ ہے۔ چاروں صوبوں کے محب وطن اور محب اسلام لوگوں کو جو اس ملک کی سلامتی اور حفاظت کی اہمیت اور قیمت کو سمجھتے ہیں، مل بیٹھ کر ان چھوٹے چھوٹے مسائل کا کوئی ایسا سمجھوتہ طے کرنا چاہیئے جو لوگوں کو مطمئن کر سکے۔ یہ بہت بڑی کامیابی

ہوگی ۔ لوگوں کو سوچنا چاہیئے کہ ملک کی سلامتی اور آزادی کے مقابلے میں ان زمینوں کی اور ان مسئلوں کی کیا اہمیت ہے ۔

س : ۱۹۸۳ء میں ایم آر ڈی کی تحریک کا تجزیہ بھی آپ نے کیا ہوگا ۔ آپ کے خیال میں یہ تحریک صرف سندھ تک کیوں محدود رہی اور دوسرے یہ ایک دم ایجی ٹیشن اور تشدد کی راہ پر کیسے چل نکلی ۔ حالانکہ اس سے پہلے بھی اس ملک میں تحریکیں چلتی رہیں مگر وہ اتنی پرتشدد نہیں تھیں ۔

ج : اصل میں سندھ کی صورت حال پہلے عیاں نہیں تھی ۔ ایک لاوا پک رہا تھا ۔ فکری تحریک کافی عرصے سے چل رہی تھی مسائل بڑھتے جا رہے تھے ۔ ایسی سنگین صورتحال باقی تینوں صوبوں میں نہیں تھی ۔

مگر سندھ میں مسائل موجود تھے لوگوں کو سڑک پر لانے کے لئے مواد موجود تھا ۔ اس لئے سندھ اُن کے لئے نرم چارہ ثابت ہوا ۔ اور وہاں تحریک نے زور پکڑا ۔ نئی نئی قوتیں سامنے آئیں ۔ حتیٰ کہ دینی لوگوں نے بھی اُس میں حصہ لیا ۔ لیکن جب غیر ملکی مداخلت اس انداز سے ہوئی کہ اُس پر اظہار خیال کیا آنجہانی اندرا گاندھی نے تو لوگ متنبہ ہوئے کہ ہم تو دشمنوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں ۔ جس کے نتیجے میں تحریک ٹھنڈی پڑ گئی ۔ لیکن بظاہر سکون ہے ۔ اسباب اب بھی موجود ہیں بے چینی اب بھی موجود ہے ۔ وہ عناصر بھی موجود ہیں ۔ اگر حسن تدبیر سے مسائل کو حل نہ کیا گیا تو وہ صورت حال دوبارہ بھی پیدا ہو سکتی ہے ۔ اس لئے اس وقت محب وطن اور محب اسلام لوگوں کو دور سے بیٹھ کر تماشا نہیں دیکھنا چاہیئے ۔ اب ہمارے اسٹیبلشمنٹ اور حکمرانوں کے تدبر کا امتحان ہے ۔ اگر بڑے بھائی کی زیادتی ہے تو باقی بھائی مل بیٹھ کر اُسے سمجھائیں ۔ صورتحال کا تجزیہ کریں کوئی حکمت عملی طے کریں ۔ اگر ارادہ صحیح ہو تو کسی مسئلے کا حل ناممکن نہیں ہوتا ۔

س : ۱۹۸۳ء کی تحریک کے بعد بھی سندھ اور پنجاب کے درمیان عوامی سطح پر رابطے کی ضرورت شدت سے محسوس کی گئی تھی ۔ ڈاکٹر اسرار صاحب نے بھی اندرون سندھ کے دورے کے بعد اس عوامی رابطے کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے ہر مہینے سندھ کا دورہ کرنے کا اعلان کیا تھا ۔ بحیثیت مجموعی اس عوامی رابطے کی کیا صورت ہے ۔

ج : کچھ انفرادی کوشش ہوئی ہے وہ بھی صرف معلومات کی حد تک ۔ یہ مسئلہ تو بڑے پیمانے پر مباحثے کا تقاضا کرتا ہے ۔ اور پھر معاملات کو سمجھنے کے بعد عمل کی ضرورت ہے ۔ حکومت کی سطح پر بڑے اور جرأت مندانہ سیاسی فیصلوں کی ضرورت ہے ۔ عوامی سطح پر رابطے سے تو صرف لوگوں کو مطمئن کرنے کی ایک صورت بن سکتی ہے کہ

جناب آپ کے مسائل و مشکلات میں ہم بھی آپ کے ساتھ ہیں۔ اور دوسرے صوبوں کے لوگ آئیں تو دین کے حوالے سے آئیں۔ اگر پھر کوئی مادی حوالے تلاش کیے گئے تو مزید اُلجھنیں اور فتنے کی نئی صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ جہاں تک ڈاکٹر صاحب کے دورے اور تجزیئے کا تعلق ہے تو پہلی بار یہ چیز ہمارے سامنے آئی کہ اُن کا تجزیہ غیر معمولی طور پر اور حیرت انگیز حد تک صحیح ہے۔ سندھ کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کے خیالات کو لوگوں نے بڑے غور سے پڑھا ہے اور چونکہ ڈاکٹر صاحب کی حیثیت معمولی نہیں ہے اور دین کے حوالے سے اُن کا بڑا مقام ہے اس لیے لوگ اُن کی باتوں کی طرف متوجہ ہوئے ہیں لیکن یہ بالکل ابتدا ہے اس مسئلے کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو چاہیئے کہ وہ مزید دورے کریں۔ لوگوں سے ملیں، براہِ راست معلومات حاصل کریں۔ زمینداروں سے ملیں، طلبہ سے ملیں، جن لوگوں کو شکایات ہیں، اُن سے ملیں۔ اُن کی کچھ جائز شکایات ہوں گی تو کچھ غلط فہمیاں اور شکوک بھی ہوں گے۔ مل جُل کر بیٹھنے سے وہ شبہات سامنے آئیں گے اور ان کے دُور ہونے کی صورتیں بھی نکلیں گی۔ لیکن یہ تب ہوگا کہ اخلاص کے ساتھ عمل ہو۔ اگر صرف شہرت طلبی اور سیاسی مفادات کا معاملہ ہُوا یا صرف ہمدردی کا تاثر پیدا کیا گیا اور مسئلے کو ہاتھ لگا کر چھوڑ دیا گیا گہرائی میں نہیں گئے تو مزید نقصان ہوگا۔ لوگ سمجھیں گے کہ ہمارے ساتھ مذاق ہو رہا ہے۔ اس طرح کے مذاق پہلے بھی بہت ہوئے ہیں۔ کئی وفود آئے اور سرسری باتیں کر کے چلے گئے۔ مشرقی پاکستان کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ سرکاری لوگوں اور سرمایہ داروں کے وفود جاتے رہے۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں ٹھہرتے رہے۔ پلاننگ کمشن کے ڈپٹی چیئرمین نے جو قادیانی تھا، اس نے اُس قت ساری نفرت کی بنیاد رکھی تھی۔ یہاں سے سرمایہ داروں نے جا کر بڑے بڑے کارخانے لگائے اور بڑی بڑی کوٹھیاں اور بنگلے بنائے۔ مقامی آبادی کے جھونپڑوں کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔ یہاں سے جا کر لوگ غریب بنگال کے سائیکل رکشا میں سیر کرتے رہے۔ پھر جو نتیجہ نکلا ہے، وہ سب کے سامنے ہے۔

س: اس عوامی رابطے کو بڑھانے کی کوئی عملی صورت بھی آپ کو نظر آتی ہے؟

ج: عملی صورت تو یہی ہے کہ ملت کا درد رکھنے والے دین کا فہم اور شعور رکھنے والے لوگ آگے آئیں۔ دین کے حوالے سے بات کریں۔ سندھ باب الاسلام ہے۔ لوگ دین کے شیدائی ہیں۔ اُن کا مزاج اسلامی ہے۔ جو لوگ دین کی راہ سے ہٹ گئے ہیں اُن سے بھی بات چیت ہو سکتی ہے۔ صورت حال کا تجزیہ کر کے اُن کو ہم سمجھا سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے مخلص لوگوں کی ضرورت ہے اور اُن کی کمی ہے۔ مجھے تو یقین نہیں ہے کہ اتنے مخلص

لوگ ہمیں مل سکیں گے۔ اور یہی مرحلہ ہے جہاں آدمی پریشان ہوتا ہے۔ جو لوگ سیاسی ہیں اُن کے سامنے تو سیاست کی مصروفیات ہی اس قدر رہتی ہیں کہ وہ ان کاموں کے لیے وقت نہیں نکال سکتے ہیں جبکہ یہ محرومیاں اور مسائل گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کی بنیادیں پختہ تر ہوتی جا رہی ہیں اور جن چیزوں کو لوگ معمولی اور وقتی قرار دیتے ہیں وہی آگے چل کر سارے معاملے کو لپیٹ میں لے لیتی ہیں۔

س : سندھ کے بھٹو قبیلے سے آپ کا تعلق ہے۔ اس کی تاریخی اور نسلی حیثیت کے بارے کچھ فرمائیے۔

ج : اِس موضوع سے نہ مجھے دلچسپی ہے نہ میں نے تحقیق کی ہے۔ بس کچھ سنی سنائی باتیں ہیں۔ ویسے خاصا بڑا قبیلہ ہے۔ کم و بیش لاکھ ڈیڑھ لاکھ کی تعداد ہے پورے صوبے میں۔ اس موضوع پر ایک کتاب بھی چھپی ہے اردو میں، جس میں لکھا ہے کہ یہ اریجا قوم ہے جو شام سے ہجرت کر کے آئی تھی۔ زیادہ تر عوامی روایات میں اور بزرگوں سے جو باتیں سُنی ہیں اُن کے مطابق یہ قبیلہ پنجاب سے آیا ہے۔ اب معلوم ہوا ہے کہ مشرقی پنجاب میں "بھٹہ" نام کا ایک سٹیشن ہے اور پنجاب میں بھی کچھ لوگ "بھٹہ" کہلاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہی بھٹہ سندھ میں بھٹو بن گیا ہو۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ سندھ میں "آرائیں" اور "بھٹو" ایک ہی چیز ہے۔ زیادہ تر لوگ زراعت پیشہ ہیں۔ باغات اور سبزیوں کی کاشت کے ماہر مانے جاتے ہیں۔ بحیثیتِ مجموعی ایک جفاکش قبیلہ ہے۔ انتہا پسندی اور کشمکش ان کے مزاج میں شامل ہے۔

س : سندھ میں تحریکِ اسلامی کی ایک اہم شخصیت مولانا جان محمد بھٹو مرحوم سے آپ کو خصوصی تعلق رہا۔ اُن کی شخصیت کے بارے آپ کے تاثرات کیا ہیں؟

ج : مولانا جان محمد بھٹو تو اسلاف کا نمونہ تھے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے صرف کی۔ بہت مجاہد، بہت سادہ مزاج، اُن کی شخصیت اور کردار سے اسلام کی عظیم روایات ٹپکتی تھیں۔ پیار اور محبت میں ڈوبی ہوئی شخصیت۔ ان کی نمایاں صفت درویشی تھی، عالمِ باعمل تھے، زاہد مجاہد تہجد گزار، اپنی دُھن کے پکے ــــ اُن کے جانے کے بعد ہم یہ سمجھتے ہیں کہ سندھ یتیم ہو گیا۔ بہت بڑا خلا ہے، جسے پُر کرنا بڑا مشکل ہے۔

س : اپنی ذات اور اپنے خاندان کے حوالے سے بھی کچھ فرمائیے۔ تحریکِ اسلامی کے ساتھ آپ کا تعارف اور تعلق کیسے ہوا؟

ج : میری پوری زندگی کشمکش اور جدّوجہد سے عبارت ہے۔ جب میں ایک برس کا تھا تو میرے والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ بہت چھوٹی عمر میں مجھے روزگار

کے لیے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا پڑا۔ نو دس برس کی عمر میں مجھے روزگار کی فکر کرنی پڑی۔ میں نے سکالرشپ کا امتحان دیا اور پاس ہوگیا۔ دس روپے ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔ پھر میں نے اپنا دودھ کا کاروبار شروع کیا۔ پڑھنا بھی تھا اور دودھ بھی بیچنا تھا۔ پہلے گائے رکھی پھر بھینسیں رکھیں۔ جب یہ سلسلہ زیادہ بڑھا تو بزرگوں نے کہا کہ یہ تو کاروباری ہوگیا ہے۔ اس پر میرے بزرگوں نے اپنے بچے بھی میرے پاس بھیج دیئے کہ ان کو آپ پڑھائیں۔ یہ ذمہ داری بھی سنبھالی۔ شروع سے تعلق نیک لوگوں سے ہوگیا تو اللہ کے فضل سے عادات درست ہوگئیں۔ شروع سے نماز سے تعلق ہوگیا۔ جب یاد کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ بے نماز میں کبھی نہیں رہا۔ بچپن ہی سے روزہ بھی رکھنا شروع کیا۔ مولانا جان محمد بھٹو مرحوم سے چھوٹی عمر میں ہی تعلق ہوگیا تھا۔ ان کی شفقت اور راہنمائی میں بڑا سفر طے کیا۔ میری تعلیم کندھ کوٹ میں ہوئی ہے اور میرا آبائی گھر ضلع جیکب آباد کے ایک چھوٹے سے گاؤں مبارک پور میں ہے۔ میرے والد مرحوم حاجی غلام قادر بھی زمیندار تھے۔ لیکن کسی وجہ سے انہیں اپنی زمینیں بیچنا پڑیں۔ بزرگ بتاتے ہیں کہ وہ بہت سخی تھے۔ ہمارا گھر ایک چوراہے پر واقع تھا۔ وہ راستے میں بیٹھ جاتے تھے اور کوئی آدمی گزرے اس سے تعلق واقفیت ہو یا نہ ہو اس کو وہ کھانا ضرور کھلاتے تھے۔ اور اسی انتظار میں کہ شاید کوئی مسافر آجائے کھانا بہت دیر سے کھاتے۔

ایک دفعہ ایک قافلہ آیا بیل گاڑیوں پر۔ والد باہر موجود نہ تھے۔ انہوں نے کھانا مانگا تو ملازموں نے کہہ دیا کہ اس وقت کھانا نہیں ہے وہ لوگ چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد والد صاحب کو معلوم ہوا تو فوراً ملازموں کو دوڑایا کہ ان لوگوں کو بلا کر لاؤ۔ وہ میلوں آگے جا چکے تھے۔ بہرحال ملازم بڑی منت سماجت کر کے انہیں واپس لائے۔ اور پھر سب کو کھانا کھلا کر رخصت کیا۔ اور والد صاحب نے ان مہمانوں سے ملازموں کی بدتہذیبی کی معافی بھی مانگی۔ وہ اپنی زندگی میں بہت زاہد و عابد آدمی تھے۔ والدہ محترمہ نے مجھے بتایا کہ رات کو تہجد میں بہت روتے تھے اور بہت کم سوتے تھے۔ میرے والد اور دادا کی موت میں بڑی عجیب مماثلت ہے۔ دونوں کی کوئی قبر نہیں ہے۔ کیونکہ دونوں نے اپنے اپنے وقت میں سفرِ حج سے واپسی پر بحری جہاز ہی میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور لوگ بتاتے ہیں کہ دونوں کی میتوں کو ایک ہی مقام پر سمندر کے حوالے کیا گیا۔ والد کا انتقال ۱۹۴۵ء میں ہوا۔ یہ تو تھا کچھ خاندانی پس منظر میں نے ۱۹۶۱ء میں میٹرک کے بعد بحیثیت استاد اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ دین سے تعلق تو بچپن ہی سے تھا۔ پھر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تصانیف کا مطالعہ کیا۔

انہوں نے ہمارے ذہن کو صاف کیا۔ موجودہ دور کے تمام فتنوں یعنی اشتراکیت، قومیت، لادینیت اور مغربیت کو ہم نے سید مودودی رح کے لٹریچر کی روشنی میں سمجھا۔ پھر اُن سے ذاتی تعلق بھی قائم ہوا۔ وہ آخر وقت تک رہا اور اب بھی ہے۔ اُن کی خدمات ملت کے لیے مسلمانوں کے لیے ناقابلِ فراموش ہیں۔ اُن کی زندگی میں اُن سے ملاقاتیں بھی رہیں۔ بہت مہربان تھے مجھ پر۔ ذاتی طور پر انہوں نے جن خطوط پر کام کرنے کے لیے رہنمائی کی ہم نے اُن خطوط پر چلنے کی کوشش کی۔

۱۹۶۷ء میں مَیں نے سندھ یونیورسٹی سے ایم اے اسلامیات کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن کے ساتھ مجھے گولڈ میڈل ملا۔ اب ۱۹۶۸ء سے مَیں کالج کے نوجوانوں کو اسلامیات پڑھا رہا ہوں۔

س : تنظیم اسلامی اور ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ساتھ آپ کب متعارف ہوئے؟

ج : ڈاکٹر صاحب سے غائبانہ تعارف تو تھا۔ سکھر کی مکی مسجد میں ایک بار درسِ قرآن بھی سُنا تھا۔ نومبر ۱۹۸۵ء میں ہم نے اُنہیں قومی سیرت کانفرنس میں خطاب کی دعوت دی۔ اُن کے خطاب سے ہم لوگ کافی متاثر ہوئے۔ پھر ہم نے مختلف شہروں میں ڈاکٹر صاحب کے خطابات کا پروگرام بنایا۔ اس طرح اُن کی ذات کے ساتھ اُن کی تنظیم سے بھی تعارف ہوا۔ اور پھر مَیں نے تنظیمِ اسلامی میں شمولیت کا فارم بھی پُر کیا۔ ڈاکٹر صاحب کا جو مشن ہے اُن کے سامنے جو کام ہے وہ بہت بڑا ہے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مجھے اس قابل بنا دے کہ مَیں بھی اس راستے میں کچھ خدمت کر سکوں۔

نماز مسنون

نماز سے متعلق جملہ مسائل کے بیان پر مشتمل ایک نہایت گرانقدر کتاب

نماز مسنون تالیف: حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی

جس میں بیان مسائل کے ساتھ ساتھ کتاب اللہ، احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے دلائل بھی درج کیے گئے ہیں ——— قیمت ۷۵/۰ روپے

بڑے سائز کے ۲۴۰ صفحات۔ عمدہ سفید کاغذ۔ اعلیٰ کتابت۔ معیاری طباعت۔ دیدہ زیب جلد۔

ناشر: مکتبہ دروس القرآن، فاروق گنج، گوجرانوالہ

Coca-Cola
Coca-Cola is it!
TRADE-MARK REGD

منتخب تعزیتی خطوط

برسانحۂ ارتحال عزیزان عبداللہ طاہر سیال و محمد حمید احمد

مکتوب گرامی جناب مفتی سید سیاح الدین کاکاخیل - اسلام آباد

محترم و مکرم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب زاد اللہ مجدہ و عزہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تسلیماتِ مسنونہ کے بعد عرض ہے کہ بعض دفعہ مصروفیات کی وجہ سے اخبار پڑھنے کا موقع نہیں ملتا یا سرسری دیکھ لیتا ہوں تمام خبریں پڑھنے کا موقع نہیں ہوتا۔ اس لئے میں نے مستقل خبر تو نہیں پڑھی مگر کل ۳۰ ستمبر کے اخبار جسارت کراچی میں ایک فوٹو پر نظر پڑی جس کے نیچے لکھا تھا کہ "جماعتِ اسلامی پاکستان کے امیر میاں طفیل محمد مولانا عبدالمالک کاندھلوی اور دیگر افراد ڈاکٹر اسرار احمد کے داماد اور بھانجے کی نمازِ جنازہ میں شرکت کے لئے جارہے ہیں" چونکہ فوٹو کے ساتھ اس قدر بالتفصیل نمازِ جنازہ کی بات لکھی گئی تھی اس لئے یقین کرنا پڑا کہ آپ کے داماد اور بھانجے کی وفات کا حادثہ پیش آیا ہے۔ پڑھ کر حسبِ ارشادِ خداوندی انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور دعائے مغفرت کی۔ مرحوم کے ساتھ آپ کی دو نسبتیں تھیں اور دونوں نسبتوں اور جوانی میں مفارقت کی وجہ سے یقیناً طبعی اور فطری طور پر آپ کے دل کو سخت صدمہ پہنچا ہوگا۔ ایسے حوادث و مصائب کے موقع پر ارشادِ نبوی من عزّیٰ مصابًا فلہٗ مثل اجرہٖ کے مطابق تعزیت و تسلیہ ضروری اور موجبِ اجر و ثواب ہے۔ اس لئے یہ عریضہ بہ طور تعزیت نامہ ارسال کر رہا ہوں۔ آپ جیسے بزرگ کی خدمت میں تسلیہ و تعزیت کے کلمات لکھنا اور رضا بالقضا کی تلقین کرنا دراصل "پند بہ لقمان و زیرہ بہ کرمان" والی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم دیا ہے اور خاص طور پر قرآن مجید کے ساتھ آپ کا گہرا تعلق ہے خود آپ کو پتہ ہے کہ ایسے ابتلائی حوادث کے موقع پر صبر و استقامت والوں کے لئے کتنی عظیم بشارت ہے۔ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ۔ اور انہی بشارتوں سے ایک مومن کا طبعی رنج و غم کم ہو سکتا ہے اور وہ لِلّٰهِ مَا اخذ ولہ ما اعطیٰ کہہ کر صبر کر کے اللہ تعالیٰ کے ہاں سے اجر و ثواب اور انعاماتِ اخروی کا مستحق ہو سکتا ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس کی ابدی خوشیاں اور نعمتیں نصیب فرمائے۔ اس کی قبر انوارِ رحمت و مغفرت سے منور ہو اور آپ کو اور دوسرے

تمام متعلقین کو اس پر صبرِ جمیل اور اجرِ جزیل عطا فرمائے۔ فقط والسلام!
شریکِ غم اور دعا گو احقر
سید سیاح الدین کاکاخیل عفی عنہٗ
از دفتر انٹرنیشنل انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اکنامکس،
اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

مکتوب گرامی جناب مولانا محمد تقی امینی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (بھارت)

مخلصم و مکرم جناب ڈاکٹر صاحب زید مجدکم۔
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،
حادثۂ فاجعہ کی اطلاع ملی۔ بیحد صدمہ ہوا۔ اللہ سے دعا ہے کہ دونوں مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور آپ سب کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائے آمین۔ آفس پر حملہ کی بھی اطلاع ملی۔ اور اللہ کی سنت کی یاد تازہ ہوئی۔ راہ کی مشکلات اس لیے نہیں پیش آتی ہیں کہ اُٹھا ہُوا قدم رُکے بلکہ اس لیے آتی ہیں کہ اور زیادہ مضبوطی کے ساتھ قدم اُٹھایا جائے۔ جب تک اس راہ میں دل و دماغ کے آبگینہ کو پتھر سے کچلا نہیں جاتا ہے وہ چمک پیدا ہی نہیں ہوتی جو اس کام کے لیے مطلوب ہے۔ پتھر سے کچلنے کی شکلیں دل و دماغ کو دیکھ کر تجویز ہوتی ہیں۔ آپ کا معاملہ اللہ سے ہے۔ اسی سے صلہ کی توقع رکھیئے۔

منت منہ کہ خدمتِ سلطاں ہمی کنی منت از و شناس کہ بخدمت بداشتت

اللہ آپ کے ساتھ ہے وہی بہترین ساتھی اور کارساز ہے۔ اسی پر بھروسہ رکھیئے۔ اگر چہ غم و حوادث کے پہاڑ ہی کیوں نہ ٹوٹیں کام میں فرق نہ آنے دیں۔

خوشا حوادثِ پیہم خوشا یہ اشکِ رواں جو غم کے ساتھ ہو تم بھی تو غم کا کیا غم ہے

اللہ سے دعا ہے کہ آپ صحت و عافیت کے ساتھ رہیں اور اللہ اپنے کام میں لگائے رہے۔ آمین

والسلام
محمد تقی امینی

مکتوب گرامی جناب مولانا عبدالملک جامعی۔ مدینہ منورہ

مکرمی جناب ڈاکٹر صاحب، سلام مسنون
میثاق تمام ملا عشاء اور عشاء کے بعد تقریباً حرف بحرف پڑھتا ہوا جب آخری صفحہ پر پہنچ

تو عنوان پڑھ کر دنگ رہ گیا، اللہ تعالیٰ صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ مگر ڈاکٹر صاحب میری لغت میں صبر وہ ہوتا ہے جو جذبہ شکر سے معمور ہو، ورنہ صبر لاچاری کا نام ہے، اور عزائم و مقاصد والوں کے لیے تو یہ حوادث اس کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کے لیے نازل ہوتے ہیں، آپ ہرگز دل گیر نہ ہوں۔

حضرت عروہؓ بن زبیر کا پاؤں کاٹا گیا، لوگ تعزیت کو آئے فرمایا کیا، اس میں غم و رنج کی بات ہے ایک پاؤں تو گیا میرا سارا جسم صحیح سلامت ہے۔ اسی دن ایک صاحبزادی کا انتقال ہو گیا۔ لوگ آئے فرمایا، کیا بات ہے، کیا بات ہے، میرے نواڑے موجود ہیں۔ ہاں مجھے صاحبزادی کے غم میں ضرور شریک ہونا ہے، مگر تلقین میری یہی ہے کہ وہ بھی شکر اور ہزار شکر کے پہلوؤں کو تلاش کریں۔ سب سے بڑی بات تو اسلام و ایمان ہے، اور اس کے علاوہ بے شمار نعمتیں ہیں۔

والسلام، شریکِ غم
محمد عبدالملک۔ مدینہ منورہ

مکتوب گرامی جناب مولانا محمد اسحٰق الصدیقی۔ کراچی

مکرمی و محترمی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب زید مجدکم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

تازہ میثاق، (صفر ۱۴۰۷ھ اکتوبر ۱۹۸۶ء) کل موصول ہوا۔ اس میں آپ کے خویش اور بھتیجے محمد حمید احمد صاحب مرحوم اور آپ کے بھانجے عبداللہ طاہر صاحب مرحوم کے ٹریفک کے ایک المناک حادثے میں انتقال ہو جانے کی خبر پڑھ کر سخت افسوس ہوا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اللہ تعالیٰ مرحومین موصوفین پر اپنی مغفرت و رحمت کی بارش فرمائے اور انہیں اعلیٰ درجات جنت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور مرحومین موصوفین کے سب پسماندگان کو صبرِ جمیل، اور اس صدمۂ جانکاہ کا اجرِ جزیل عطا فرمائے۔ آمین۔

حسبِ فحوائے حدیث شریف دنیا مومن کے لئے قید خانہ ہے۔ ان دونوں نے اس قید سے رہائی پائی اور آزاد ہو کر اپنے اصل وطن ربِ غفور کے حضور پہنچ گئے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید قریب بہ یقین ہے کہ بڑی راحت و آسائش میں ہوں گے۔ موت تو ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف منتقل ہونے کا نام ہے۔ مومن کے لئے عالم برزخ اور عالم آخرت، عالم دنیا سے لاکھوں درجہ زیادہ راحت رساں، لطف و سرور افزا اور طرب انگیز ہوتا ہے۔ ہم سب کو بھی اسی عالم کی طرف جانا ہے۔ انشاء اللہ سب سے بہت اطمینان کے ساتھ ملاقات ہوگی۔ یہ مفارقت عارضی اور چند روزہ ہے۔ دونوں مرحومین (جہاں تک مجھے علم ہے) دین کی خدمت میں لگے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات قبول فرما کر ان کے درجات

جنّت میں بلند فرمائے اور ان پر رحمت کی مزید بارش فرمائے اور قوم کو ان کے بدلے میں مخلص خدّام اسلام نصیب فرمائے۔ آمین۔

والسّلام

محمد اسحاق صدیقی عفا اللہ عنہ۔ کراچی

مکتوب گرامی جناب محمد شفیع (م۔ش) لاہور

اعلیٰ حضرت مکرم و محترم ڈاکٹر صاحب مدظلہ،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

میری بیوی (ڈاکٹر خورشید) مجھ سے بار بار کہہ چکی ہے کہ میں اسے آپ کے ہاں لے چلوں تاکہ وہ آپ کے اہلِ خانہ سے عالیہ الیہ پران سے اظہارِ تعزیت کر سکے میں اسے ہاں ہوں کہتا رہا ہوں لیکن دل میں یہ سوچتا رہا ہوں کہ وہ ایک ایسے پیکرِ استقامت اور صبر و رضا کے اہلِ خاندان سے کیا تعزیت کرے گی۔ جو اپنے پیارے بچوں کے جنازے کے سامنے کھڑا ایسے نظر آتا تھا گویا کوہِ غم کا یہ پہاڑ جو ان پر ٹوٹا تھا ان کے کاندھوں کو جھکا نہیں سکتا۔ کیونکہ اس کے سینے میں جو عشق پرورش پاتا ہے۔ وہ ازلی اور ابدی اقدار کا حامل ہے۔ میں نے آپ کو اس روزِ الم جس کیفیت سے شناسا دیکھا۔ اس کا میرے دل پہ گہرا تاثر ہے۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ الرحمٰن الرحیم آپ کو صبرِ جمیل کی بیشمار نعمتوں سے مالا مال فرمائیں اور آپ کے عزیز و اقارب کے زخمی قلب و جگر پر اپنی رحمت کا پھاہا رکھیں۔ آمین۔ اللّٰھم آمین : زیادہ کیا عرض کروں۔

والسّلام

خاکسار، محمد شفیع (م۔ش) لاہور

مکتوب گرامی جناب اقبال احمد صدیقی۔ نگران ادارہ ابلاغِ علوم و افکارِ ملی، کراچی

واجب احترام گرامی قدر و مکرّم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مدیر مسئول ماہنامہ حکمتِ قرآن لاہور

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

آج کے اخبارات میں اس اچانک اور بڑے سانحہ کی خبر بھی نظر سے گزری کہ آپ کے داماد اور بھتیجے جناب محمد حمید احمد اور بھانجے جناب عبداللہ طاہر سیال ضلع خانیوال میں قصبہ دنیا پور کے نزدیک ایک ٹریفک حادثے میں جاں بحق ہو گئے یعنی حادثہ ٹریفک کا اور وہ بھی معمولی نہیں بلکہ جان لیوا۔ حادثے کی تفصیل فی الحقیقت کراچی کے احباب اور دردمند بہی خواہوں کو دستیاب نہیں اس لئے کوئی بات

ذوق سے کہی جارہی ہے نہ سمجھی جارہی ہے لیکن ایک بات جو فوری توجہ کی مستحق ہے وہ آپ کے لئے صبر برداشت کا یہ سنگین مرحلہ ہے۔ یہ جوان موتیں اپنے ساتھ خاندانوں کے ناقابل تلافی نقصان کے جو اثرات مابعد لائی ہیں ان کا اندازہ ان نوجوانوں کے والدین، بہن بھائی، اہل خانہ اور سرپرست و ہمدرد ہی لگا سکتے ہیں۔ آپ جیسے سادہ مزاج، متوکل علی اللہ، خدا پرست، اور نیکوکاری کے ابلاغ میں معروف پاکباز شخص کے لئے اللہ جل شانہٗ نے امتحان کا یہ مرحلہ دشوار بھی مخصوص کر رکھا ہے۔ نہ آپ نے اس کا تصور کیا ہوگا نہ کسی اور نے ـــــ جس نے سنا اور پڑھا یہی کہا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

ایک نکتہ بار بار ذہن میں آرہا ہے کہ ایسی کڑی آزمائشیں باری تعالیٰ اپنے خاص بندوں کی جانب بھیجا کرتے ہیں اور پھر دیکھتے ہیں کہ میرا بندہ میری رضا میں کتنا راضی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ گلہ مند اور شاکی ہو گیا ہو۔" الا ماشاء اللہ آپ علم و آگہی کا روشن چراغ ہیں میں آپ سے کیا عرض معروض کروں۔ مقام صبر و استقامت کی حقیقت دین مبین میں کیا ہے آپ بخوبی واقف ہیں۔ یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے آپ کو یہ استطاعت اور توانائی قلب بھی عطا فرمائے کہ آپ صدمہ کے بشری تقاضوں پر قابو پا سکیں۔ اور پورے خاندان اور سوگوار پسماندگان کو یہ عظیم سانحہ برداشت کرنے کی توفیق اسی طرح حاصل ہو جائے جیسے حضرت نائلہؓ نے اپنے نامور شوہر شہید مظلوم سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ شہادت بچشم خود دیکھ کر برداشت کر لیا تھا۔ اور بے دریغ بہتا ہوا اپنے راست باز شوہر کا سرخ سرخ لہو ان کے ایمان اور عزم حق گوئی کو متزلزل نہیں کر سکا تھا۔ اللہ تعالیٰ مرحومین کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے ان کے درجات بلند فرمائے اور بے گناہوں کے اس خون کو ہرگز ہرگز رائیگاں نہ جانے دے۔ آمین۔

براہ کرم کسی رفیق و ہمدرد کے ذمہ لگا دیں کہ مذکورہ ٹریفک حادثے کی تحقیقات پر نظر رکھیں اور اس معاملہ کی فائل سرد خانے میں نہ جانے دے تاکہ قانون اور انصاف کے تقاضے ضرور پورے ہو سکیں

پاکستان سنی کونسل کے ناظم اعلیٰ جناب سید نجی جیلانی بھی اس سانحہ پر آپ اور آپ کے خاندان سے دلی اظہار تعزیت کرتے ہیں اور سنی کونسل کے اراکین و سرپرستوں نے اس حادثہ فاجعہ پر گہرے حزن و ملال کے جذبات آپ تک پہنچانے کے لئے کہا ہے۔

"بندہ مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ اس کے ہر معاملے اور ہر حال میں اس کے لئے خیر ہی خیر ہے اگر اس کو خوشی، راحت اور آرام پہنچے تو وہ اپنے رب کا شکر ادا کرتا ہے اور یہ اس کے لئے خیر ہی خیر ہے، اور اگر اُسے کوئی دکھ اور رنج پہنچتا ہے تو وہ (اس کو بھی اپنے حکیم و کریم رب کا فیصلہ سمجھتے ہوئے اور اس کی مشیت پر یقین کرتے

ہوئے) اس پر صبر کرتا ہے اور یہ صبر بھی اس کے لئے سراسر خیر اور موجب برکت ہوتا ہے۔" (ارشادِ نبویؐ بروایت حضرت صہیبؓ۔ مسلم شریف۔ معارف الحدیث)

میرا خیال بلکہ یقین ہے کہ آنجناب بندۂ مومن کے اسی معاملۂ عجیب اور قولِ رسولؐ کے رمز سے گزر رہے ہیں۔

محترم کراچی میں آپ کی آمد کو رد کرنے کی تدبیر یہاں کسی کو پسند نہیں آئی۔ نہ ان اربابِ بست و کشاد کو اپنی آنکھ کا یہ شہتیر نظر آئے گا کہ یہاں کے اخبارات نے راولپنڈی کی ڈیٹ لائن سے "مختار فورس" کے قیام کی خبریں شائع کی ہیں۔ غالباً معنیٰ اور مفہوم یکسر علم و واقفیت سے معدوم ہوں گے۔ کیونکہ کراچی میں تین چار سال سے مختار بن ثقفی کا یومِ اہتمام سے منایا جانے لگا ہے اور روزناموں میں اس کے باقاعدہ اشتہارات بھی شائع ہوتے ہیں۔ اس بادِ سموم سے سب بے خبر رہتے ہیں۔ یا جان کر انجان بنے رہتے ہیں۔ جب طوفان آجاتا ہے تو فرقوں اور انتظامی سربراہوں کے غم و غصّہ کی طنابیں اکھڑ جاتی ہیں۔ آپ بعض الفاظ اور تاریخی حوالوں کی تعبیر و تصریحات کرنے کے 'ناکردہ قصور' میں ہی ساری تنقید و تشنیع کا ہدف بنے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف عامۃ الناس کی بے خبری اور لاعلمی کا فائدہ یوں اٹھایا جا رہا ہے کہ پہلے اس کی کوئی نظیر موجود ہے نہ روایت ہے

محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

آپ کا ایک شریکِ غم اقبال احمد صدیقی

نگران ادارہ ابلاغ علوم و افکار ملّی۔ کراچی

مکتوبِ گرامی جناب پروفیسر احمد الدین مارہروی۔ کراچی

محبّی و مکرّمی جناب ڈاکٹر صاحب! السلام علیکم

آج کے اخبار سے اس حادثۂ جانکاہ کی اطلاع ملی جس میں محمد حمید اور عبداللہ طاہر کی ہلاکت کا بہت مجمل طور پر ذکر ہے۔ ہم سب کو اس خبر سے جو صدمہ ہوا اس کو بیان کرنے کے لئے الفاظ جواب دے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں کی مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آپ کو جن کا دل خدائے تعالیٰ کے اس مژدہ سے لبریز ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ، صبر کی تلقین کرنے کی ضرورت تو محسوس نہیں ہوتی لیکن اور کیا بھی کیا جائے کہ رسم دوراں اینست۔ بقول غالب کسی کا دل جگر مجروح ہو جائے اور ہم اس سے کہیں کہ فریاد نہ کر۔ وہ نہ کرے گا تو دل خود کرے گا۔ لیکن خدائے تعالیٰ ہی نے فرمایا ہے کہ ہم تمہارا جان و مال دونوں ہی کے اتلاف سے امتحان لیں گے اور نیک بندے اس پر اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کہا کریں گے۔ چنانچہ آج ہم دونوں کی یہی کیفیت ہے مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔ خود تو آپ

صبر کریں گے ہی لیکن پس ماندگان کو صبر کی تلقین بھی آپ ہی کے ذمّہ ہے اور مجھے امید ہے کہ آپ اس سے بھی کما حقہٗ عہدہ برآ ہوں گے
میرا اور آپ کا شاگرد شمیم الرحمٰن بھی آپ کے اس غم میں شریک ہے۔
آپ کے غم میں شریک نیاز مند
احمد الدین مارہروی ۔ کراچی

مکتوب گرامی جناب شخین صابر ۔ نگران اسلامی سنّی سنٹر، لاہور

محبّی و مشفقی السیّد المحترم ڈاکٹر صاحب
السّلام علیکم
کیا لکھوں ۔ کیسے لکھوں ! آج کا اخبار دیکھ کر سوالیہ فقرہ بن کر رہ گیا ہوں۔
جو اسؐ کے نام اور دین کا پرچم بلند کرتے ہیں۔ کیا سب آزمائشیں انہی کے لئے ہیں۔ اللہ ان کو صبر جمیل عطا فرمادے اور مزید آزمائشوں سے محفوظ رکھے۔
ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد
اگر چارپائی سے نہ لگا ہوتا تو خود حاضر ہوتا ۔ محتاج بخشش کاملہ
شخین صابر ۔ اچھرہ لاہور

مکتوب گرامی جناب خسروی ۔ کراچی

مکرّمی السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ
ابھی ابھی "جنگ" میں آپ کے دونوں عزیزوں کے مہلک حادثہ کی خبر پڑھ کر صدمہ ہوا۔ ع
ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد" خداوند کریم مرحومین کی بشری لغزشوں سے صرف نظر فرما کر مقامات قرب میں ہر لحہ ترفیع عطا کرے اور آپ، نیز جملہ متاثرین کو صبر جمیل کا حوصلہ اور اس پر اجر جزیل عطا فرمائے۔
یوم تخلیق سے ہی ہر نفس نفس رجعت کرنے لگتا ہے۔ اسی لئے "راجعون" کہا ہے۔ "ترجعون" نہیں۔ جبتک "رجعت" کی تکمیل نہ ہو ہم سب راجعون ہی رہتے ہیں۔ کوئی آگے بڑھ جاتا ہے کوئی پیچھے رہ جاتا ہے، اس میں عمر کی قید نہیں۔ منزل پر سب کو پہنچنا ہے۔ جانے والوں اور رہنے والوں کو بالآخر مل ہی جانا ہے۔ جیسے وصال عارضی تھا ایسے ہی یہ فراق بھی عارضی ہے۔ مگر یہ صحیح ہونے کے باوجود دل پر تو جو گزرتی ہے وہ گزرتی ہی ہے۔ تلقین، صبر عقلی ہے اور غم وجدانی۔ سہو اور نسیان کی نعمت اگر نہ ملی ہوتی تو آدمی پہلے ہی صدمہ سے مرجاتا۔
تمام متاثرین کو بھی میری طرف سے تعزیت پہنچا دیجئے۔ والسّلام ! دعا جو و دعا گو
خسروی ناظم آباد۔ کراچی

بذریعہ تار و خطوط تعزیت کرنیوالے دیگر حضرات کے اسمائے گرامی ،

(۱) اندرونِ ملک سے

۱	عبدالواحد عاصم صاحب	کراچی	
۲	انور احمد صاحب	کراچی	
۳	مولانا غلام محمد صاحب	کراچی	
۴	عبدالقادر صاحب و رفقاء تنظیم	حیدرآباد	
۵	امتیاز احمد صاحب	فیصل آباد	
۶	ڈاکٹر تقی الدین صاحب	کراچی	
۷	آنسہ بے نظیر بھٹو	کراچی	
۸	محمد رفیق انور صاحب	گوجرانوالہ	
۹	محمد اعظم فاروقی صاحب	کراچی	
۱۰	منصور احمد بٹلہ صاحب	کراچی	
۱۱	الطاف امرتسری صاحب ایڈووکیٹ	ملتان	
۱۲	شیخ عبدالمجید لاکھانی و رضوان احمد صاحب	کراچی	
۱۳	رفقاء تنظیم اسلامی	کوئٹہ	
۱۴	صدر اور ممبران ۔ فاران کلب	کراچی	
۱۵	عبداللہ فاروق صاحب	کراچی	
۱۶	عبداللہ مسعود صاحب	کراچی	
۱۷	حسن و قیوم شیخ صاحب	کراچی	
۱۸	محمد اکرم صاحب	سوات	
۱۹	عبدالباری صاحب	منگورہ	
۲۰	یوسف ایچ شیرازی صاحب	کراچی	
۲۱	عبدالقادر شیخ صاحب	کراچی	
۲۲	قاری حبیب الرحمٰن زاہد صاحب	لاہور	
۲۳	مولانا سمیع الحق صاحب	اکوڑہ خٹک	
۲۴	اے کیو بریلوی صاحب	کراچی	
۲۵	الطاف احمد اللہ والا صاحب	کراچی	
۲۶	محمد یامین صاحب (دو خطوط)	کراچی	
۲۷	ڈاکٹر عبدالغفور جمالی صاحب	لاڑکانہ	
۲۸	پروفیسر عبدالغفور احمد صاحب	کراچی	
۲۹	ڈاکٹر ظہور احمد صاحب	دینا پور	
۳۰	ظفر اللہ خان صاحب	کراچی	
۳۱	السید نجمی جیلانی صاحب	کراچی	
۳۲	محمد محبوب الٰہی صاحب	چونیاں	
۳۳	مولانا شمس الدوران صاحب	مانسہرہ	
۳۴	محمد نفیس صاحب	سرگودھا	
۳۵	اکرام اللہ خان جسوال صاحب	آزاد کشمیر	
۳۶	بدیع الدین نظر صاحب	کراچی	
۳۷	جناب خلیق احمد صاحب	کراچی	
۳۸	شیخ خوشی محمد صاحب	لاہور	
۳۹	شیخ جمیل الرحمٰن صاحب	کراچی	
۴۰	حکیم محمد نصیر الدین ندوی صاحب	کراچی	
۴۱	ڈاکٹر سید ممتاز حسین صاحب	لاہور	
۴۲	شجاعت علی خان صاحب	راولپنڈی	

۴۴ عظیم اشرف صاحب لاہور
۴۵ مولانا محمد متین ہاشمی صاحب لاہور
۴۷ ظہیر زیدی صاحب کراچی
۴۹ محمد صالح صاحب گوجرانوالہ
۵۱ محمد ناصر خاں صاحب لاہور
۵۲ سید اعجاز احمد بخاری صاحب بہاولپور
۵۵ مولانا عبداللطیف انور صاحب ساہیوال
۵۷ بیگم چوہدری نثار احمد صاحبہ لاہور
۵۹ ڈاکٹر محمد طاہر خاکوانی صاحب ملتان
۶۱ زاہد علی اشرفی صاحب کراچی
۶۳ ابرار احمد صاحب کراچی
۶۵ سید محمد آزاد صاحب آزاد کشمیر
۶۷ عبدالرشید صاحب کراچی
۶۹ سرشار الحق صاحب سرگودھا
۷۱ شوکت مند خاں صاحب مظفر گڑھ
۷۳ میجر محمد اسماعیل صاحب سکھر
۷۵ محمد افضل راٹھور صاحب لاہور
۷۷ محمد اسماعیل چوہدری صاحب ایڈووکیٹ لاہور
۷۹ اسامہ عبدالقادر صاحب کراچی
۸۱ محمد جمیل خان صاحب دہاڑی
۸۳ عزیز احمد صاحب فیصل آباد
۸۵ نثار احمد صاحب لاہور
۸۷ محمد فہیم صاحب باجوڑ
۸۹ میجر عارف سعید صاحب اوکاڑہ کینٹ
۹۱ محمد اظہر قریشی صاحب قیم جماعت اسلامی سندھ کراچی
۹۳ ڈاکٹر محمد نذیر مسلم صاحب رحیم یار خاں
۹۵ قاضی معین الدین احمد صاحب لاہور

۴۴ سید زرین شاہ صاحب کراچی
۴۶ مولانا زاہد الراشدی صاحب گوجرانوالہ
۴۸ نجیب صدیقی صاحب سکھر
۵۰ ڈاکٹر عبدالخالق صاحب (دو خطوط) رحیم یار خاں
۵۲ جناب نواز شریف صاحب وزیر اعلیٰ پنجاب لاہور
۵۴ ڈاکٹر جمشید عالم صاحب تھرپارکر
۵۶ عبدالخالق بلوچ صاحب کندھ کوٹ، جیکب آباد
۵۸ محمد اکرم صاحب حیدر آباد
۶۰ محمد مظہر خاں صاحب اسلام آباد
۶۲ محمد خلیل صاحب لاہور
۶۴ ڈاکٹر غلام محمد صاحب گوجرانوالہ
۶۶ ذوالفقار نیاز صاحب ملتان
۶۸ حکیم احسان علی صاحب منڈی بہاؤالدین
۷۰ ڈاکٹر ایم اصغر خان جدون صاحب لاہور
۷۲ مولانا ابوسعید محمد رمضان علوی صاحب راولپنڈی
۷۴ سید احمد حسن صاحب (نامعلوم)
۷۶ نیاز احمد خان ایڈووکیٹ کراچی
۷۸ قاضی عبدالقادر صاحب کراچی
۸۰ محفوظ احمد مرغوب صاحب اسلام آباد
۸۲ محمد صادق صاحب ڈیرہ اسماعیل خان
۸۴ جواد احمد صاحب کراچی
۸۶ ایم عبدالحمید غالب صاحب یزمان بہاولپور
۸۸ محمد عقیل صدیقی صاحب ملتان
۹۰ مظہر علی ادیب صاحب لاہور
۹۲ مولانا جان محمد عباسی امیر جماعت اسلامی سندھ کراچی
۹۴ حافظ محمد ادریس صاحب منصورہ، لاہور
۹۶ میجر (ریٹائرڈ) عبدالکریم صاحب کراچی

۹۷ میاں عبدالحفیظ صاحب رحیم یار خاں
۹۸ علامہ سید غلام شبیر بخاری صاحب لاہور
۹۹ ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی صاحب پشاور
۱۰۰ م طیب عاطر صاحب کراچی
۱۰۱ پروفیسر اسد اللہ بھٹو صاحب سکھر
۱۰۲ محمد منیر احمد صاحب لاہور
۱۰۳ عبدالعزیز بٹ صاحب و ممبران انجمن رفاہ عام شاد باغ لاہور
۱۰۴ شاہ مصباح الدین شکیل صاحب کراچی
۱۰۵ جناب مشکور حسین یاد صاحب لاہور
۱۰۶ میجر افتخار احمد بشر صاحب بہاولپور
۱۰۷ جسٹس تنزیل الرحمٰن صاحب کراچی

(ب) بیرون پاکستان سے

۱ طفیل گوندل صاحب راسخ الخیمہ
۲ ڈاکٹر عبدالفتاح ٹورنٹو۔ کینیڈا
۳ عبدالحکیم صاحب دہلی۔ بھارت
۴ یونس علی صاحب سکندریہ۔ مصر
۵ محمد اصغر حبیب صاحب جدہ سعودی عرب
۶ ایم طارق بٹ صاحب العین متحدہ عرب امارات
۷ منیر احمد ثاقب صاحب الریاض سعودی عرب
۸ محمد فاروق صاحب الریاض سعودی عرب
۹ محمد کریم صاحب " "
۱۰ خالد محمود صاحب " "
۱۱ ڈاکٹر ارشاد احمد صاحب " "
۱۲ ریاض احمد بخاری صاحب " "
۱۳ خادم حسین ڈوگر صاحب " "
۱۴ نرگس اقبال صاحبہ " "
۱۵ غلام مصطفیٰ صاحب " "
۱۶ سید عمر خاں صاحب " "
۱۷ فرحت علی برنی صاحب جدہ "
۱۸ محمد اختر صاحب شارجہ متحدہ عرب امارات
۱۹ محمد عبدالرشید رحمانی صاحب " "
۲۰ محمد مشتاق بیگ صاحب ابوظبی
۲۱ افتخار احمد عباسی صاحب ابوظبی
۲۲ عصمت جاوید صاحب دوحہ۔ قطر
۲۳ مسز عذرا اشتاق صاحب "
۲۴ یحییٰ عبدالشکور صاحب جدہ سعودی عرب
۲۵ محمد سرفراز میمن صاحب "
۲۶ محمد عطاالرحمٰن صاحب ریاض۔ "
۲۷ غازی عزیز صاحب الخبر سعودی عرب
۲۸ علیم خاں صاحب ریاض۔ سعودی عرب
۲۹ حسن الدین احمد صاحب جدہ " "
۳۰ گلزار محمد بھٹی صاحب جدہ۔ " "
۳۱ حبیب حسن عبدالغفار صاحب لندن
۳۲ گلزار احمد صاحب مسقط۔ اومان
۳۳ نسیم الدین صاحب ورفقاء تنظیم ابوظبی
۳۴ اشفاق احمد صاحب ابوظبی
۳۵ مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحب دہلی۔ بھارت
۳۶ عباس حسین ملک صاحب الخبر سعودی عرب

افکار و آراء

ٹی وی اور ریڈیو کی فرقہ پرستانہ پالیسی

آپ نے پنجاب کے شیعہ سنی تصادم پر اپنے اداریہ میں پاکستان کے ریڈیو اور ٹیلیویژن کی عاقبت نااندیشانہ پالیسی پر بجا تنقید کی ہے۔ یہ احساس کہ پاکستان ریڈیو اور ٹیلیویژن کو ایک فرقہ کے قبضے میں دیدیا گیا ہے اگرچہ بہت پرانا ہے لیکن اب چند سالوں سے اس احساس کی شدت میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ محرم اور دوسرے شیعی عقائد کی تشہیر سے متعلق مذکورہ بالا سرکاری اداروں کی پالیسی نہ صرف پاکستان کی مسلم اکثریت کے ساتھ کھلی زیادتی ہے۔ نہ صرف ایک اشتعال انگیز فعل ہے بلکہ پاکستان کے آئین اور حکومت کی اس مسلمہ پالیسی کے خلاف بھی ہے کہ کسی ایک فرقہ کے نظریات کو اور اختلافی مسائل کو ریڈیو اور ٹیلیویژن پر پیش نہ کیا جائے۔ لیکن جب ان اداروں کے پروگراموں خصوصاً محرم الحرام کے پہلے دس دن کے ریڈیو اور ٹی وی پروگراموں پر نظر ڈالی جاتی ہے تو ہمارا ریڈیو اور ٹی وی پاکستان کا نہیں بلکہ ایران کا ریڈیو اور ٹی وی نظر آتا ہے۔ ان دنوں کے تقریباً سارے پروگرام نوحوں، مرثیوں، سلاموں، مجلسوں اور اسی قسم کی دوسری بدعتوں سے جو صرف شیعی عقائد کے ساتھ مخصوص ہیں بھرے ہوئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت پاکستان ایران کی بنی بویہ اور صفوی حکومتوں کی جانشین بن کر سرکاری طور پر ماتم کر رہی ہے یہی وجہ ہے کہ ان دس دنوں میں پاکستان کے مسلمانوں کی بیشتر تعداد ان تکلیف دہ پروگراموں کو سننے کی بجائے یا تو ریڈیو اور ٹی وی بند کر دیتی ہے یا دوسرے ملکوں کے تفریحی پروگراموں کو سننے کی کوشش کرتی ہے۔

ہماری حکومت اس تاریخی حقیقت سے واقف ہے کہ مسلمانوں کا سواد اعظم، ماتم، نوحے اور سینہ کوبی کو اپنے دینی عقیدے کے خلاف جانتا ہے اور یہ مراسم صرف شیعی فرقے کے ساتھ مخصوص ہیں اور ان کو پہلی مرتبہ موجودہ شکل چوتھی صدی ہجری میں بنی بویہ کے حکمران معز الدولہ نے دی تھی۔ یہ وہی حکومت تھی جس نے عباسی خلافت کی عزت خاک میں ملادی تھی جسے بعد میں سلجوقی ترکوں نے بویہیوں کا قلع قمع کر کے بحال کیا۔ معلوم نہیں یہ بدعت قیام پاکستان کے بعد کن مصلحتوں یا عوارض کے تحت ہمارے ریڈیو اور ٹی وی میں رائج کر دی گئی۔ اہل سنت والجماعت مسلمانوں کی وسیع القلبی اور رواداری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اب ان اداروں کے شیعہ افسران اور فرقہ پرست غالی شیعہ علماء اور مجتہدین کی ہمت اتنی بڑھ چکی ہے کہ وہ کھل کر ٹی وی پر اپنے عقائد کا پرچار کرنے لگے ہیں۔

تحریر : ثروت صولت

اس مرتبہ خاص طور پر ٹی وی پر شیعہ مجتہدین اور ذاکرین نے جو نازیبا حرکتیں کیں وہ صرف محرم کے دس دن تک محدود نہیں رہیں بلکہ اس کے بعد بھی پروگرام "اپنی بات" میں ان کو دیدہ دلیری کے ساتھ تعریف کے ساتھ دہرایا گیا اور امامت کو نعوذ باللہ توریت، انجیل اور قرآن کہا گیا۔ کیا یہ اس بات کا ناقابل تردید ثبوت نہیں کہ ہمارا ریڈیو اور ٹی وی پوری طرح شیعہ نوکر شاہی کی گرفت میں آگیا ہے یا دے دیا گیا ہے۔

ایک طرف تو یہ شیعہ نوازی اور دوسری طرف سواد اعظم کے عقائد کو پیش نہ کرنے کے سلسلے میں اتنی سختی کی جاتی ہے کہ جب ظفر علی خان کی نعت پڑھی جاتی ہے تو اس میں سے وہ شعر حذف کر دیا جاتا ہے جس میں شاعر نے کہا ہے۔

ہیں کرنیں ایک ہی مشعل کی ابوبکرؓ و عمرؓ عثمانؓ و علیؓ
ہم رتبہ ہیں یارانِ نبی کچھ فرق نہیں ان ... روں میں

اس طرح جب اقبال کا ساقی نامہ پڑھا جاتا۔

عشرہ محرم کے سلسلے میں ٹی وی اور ریڈیو کے لیے ایسی نئی اور متوازن پالیسی کی بلا تاخیر تشکیل ناگزیر ہے جو ایک فرقہ کے بجائے تمام مسلمانوں کے عقائد سے ہم آہنگ ہو۔

تو ریڈیو، ٹی وی کے نا خداؤں کو حضرت علیؓ کے ساتھ حضرت ابوبکر کا نام دیکھ کر اتنی تکلیف ہوتی ہے کہ مفکر پاکستان اقبال کا یہ شعر حذف کر دیا جاتا ہے۔

تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے
دلِ مرتضیٰؓ سوزِ صدیقؓ دے

کیا یہ حرکت صدیق اکبرؓ اور مفکر پاکستان کی کھلی توہین نہیں ہے۔ کیا ان اداروں کی گھٹیا نوکر شاہی اقبال کو بھی ایک فرقہ پرست رہنما سمجھتی ہے؟

جناب عالی! آپ نے اپنے اداریے میں نرم الفاظ میں صرف ریڈیو اور ٹی وی کی پالیسی کو نامناسب کہہ کر ترک کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ حالانکہ یہ پالیسی کھلی شر انگیزی ہے۔ ملک کے آئین اور سالمیت کے خلاف ہے۔ اس کے ذمہ داروں کے خلاف سخت کارروائی کی جانی چاہیئے اور ان علماء اور مجتہدین کو بھی ریڈیو اور ٹی وی کے لیے اسی طرح بلیک لسٹ کر دینا چاہیئے جس طرح شاہ بلیغ الدین اور ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو بلیک لسٹ کیا گیا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ مسلمان من حیث القوم مطالبہ کریں کہ عشرۂ محرم کے سلسلے میں نئے ضوابط اور نئی پالیسی بنائی جائے جو حسب ذیل نکات پر مشتمل ہو۔

(۱) محرم کے شیعی پروگرام صرف ۹ اور ۱۰ تاریخ تک محدود کر دیئے جائیں۔ ابتدائی آٹھ دنوں میں کربلا کے حوالے سے کوئی پروگرام نہ ہو۔ بلکہ یکم محرم کو نئے سال اور سنہ ہجری کے بانی حضرت عمرؓ فاروق اعظم کے حوالے سے اسلامی اور تاریخی پروگرام پیش کیے جائیں۔

(۲) ۹ اور ۱۰ تاریخ کو بھی نوحے اور مرثیے نہ پڑھے جائیں اور نہ مجالس ماتم منعقد کی جائیں۔ نہ ماتموں وغیرہ پر مشتمل کسی قسم کے پروگرام دکھائے جائیں کیونکہ یہ صرف ایک فرقہ کے عقائد ہیں اور ان کو دوسروں پر ٹھونسنا اشتعال انگیزی ہے۔ ان دو دنوں میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے کردار پر ایک یا دو تقریروں میں اس طرح روشنی ڈالی جائے جس طرح خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی وفات کے دنوں پر ریڈیو اور ٹی وی پر پروگرام کیے جاتے ہیں۔ حضرت حسینؓ کا بہت بڑا مقام ہے۔ میں اور ہم سب ان کی خاکِ پا کے برابر بھی نہیں لیکن مسلمان من حیث الجماعت اثنا عشریہ سے لے کر مرائش اور سینے گال تک ان کو خلفائے راشدین کے برابر درجہ نہیں دیتے۔ یہ بات ہر منطق کے خلاف ہے کہ عظیم تر ہستیوں کو تو ریڈیو، ٹی وی پر صرف چند منٹ دیئے جائیں اور کمتر شخصیت کو دس دن دیئے جائیں۔ کیا یہ کھلی فرقہ پرستی نہیں ہے۔

(۳) ۹، ۱۰ محرم کو خبروں کے دوران محرم کے جلوس اور مجالس وغیرہ کے مناظر اسی طرح دکھائے جا سکتے ہیں جس طرح یوم پاکستان، یوم استقلال پاکستان اور قائد اعظم کے یوم پیدائش کی تقریبوں کو خبروں میں دکھایا جاتا ہے۔

شیعہ مجتہدین اور ذاکرین کی مدح میں جو خطوط آتے ہیں یا تیار کروائے جاتے ہیں ان کو پڑھ کر نہ سنایا جائے کیونکہ یہ سب ایک منظم منصوبہ کے تحت لکھے جاتے ہیں۔ ان کے وعظوں میں صرف لفاظی ہوتی ہے، جذبات سے کھیلا جاتا ہے اور واہ واہ کرانے کے لیے ہاتھ ہلائے اور آنکھیں مٹکائی جاتی ہیں۔ ان کے مقابلے میں دینی پروگراموں میں دوسرے علماء کی تقریریں کہیں زیادہ ٹھوس اور وزنی ہوتی ہیں۔ لیکن ان کی تعریف میں خطوط کو نشر نہیں کیا جاتا۔

مختصر یہ کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت پر ماتم اور نوحہ کرنا اور ماتمی مجلسیں منعقد کرنا صرف شیعی عقیدے کا جزو ہیں اور عام مسلمانوں کے عقائد کے خلاف ہیں لہٰذا ایسے فرقہ وارانہ مراسم کو کسی سرکاری ذریعۂ ابلاغ میں اہمیت نہیں دی جانی چاہیئے۔

مذکورہ بالا مطالبات اگرچہ چالیس سال کی غلط

شیعہ نواز پالیسی کے خلاف ہیں لیکن ایک اسلامی ملک کی حیثیت سے پاکستان کی بقا کے لیے یہ ضروری ہے۔ انڈونیشیا سے مراکش تک ایران کے علاوہ جو ایک شیعہ ملک ہے اور جس کے آئین میں شیعیت کی صراحت ہے اور کسی ملک میں بھی عشرۂ محرم کو عشرۂ ماتم نہیں بنایا جاتا۔ اب حکومت پاکستان کے لیے یہ فیصلہ کرنے کا وقت آگیا ہے کہ وہ اسلامی ملکوں کی صف میں بیٹھنا چاہتی ہے یا ایران کی طرح ملت اسلامیہ سے کٹ کر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانا چاہتی ہے۔

شاید اس کے جواب میں یہ کہا جائے کہ پاکستان میں شیعہ فرقہ کی کثیر تعداد کے پیش نظر ایسا ممکن نہیں۔ اس عذر لنگ کا ایک جواب تو یہ ہے کہ جب اکثریت شیعہ سنی اختلافی مسائل ریڈیو ٹی وی پر پیش نہیں کر سکتی تو یہ حق اقلیت کو کس طرح دیا جا سکتا ہے چاہے وہ کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اعلیٰ عہدوں پر بڑی تعداد میں فائز ہونے کی وجہ سے شیعہ اقلیت مؤثر ضرور بن گئی ہے لیکن پاکستان کی آبادی میں آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ اور صرف شہروں تک محدود ہے۔ یہ غلط تاثر کہ پاکستان میں شیعہ آبادی ایک تہائی ہے۔ مولانا رضی صاحب جیسی شخصیت کی بی بی سی کے ایک انٹرویو میں غلط بیانی بلکہ دروغ گوئی کا نتیجہ ہے۔ اگر شیعہ حضرات کو اس تعداد پر اصرار ہے تو مردم شماری میں صحیح تعداد معلوم کی جا سکتی ہے جو دو تین فی صد سے زیادہ نہیں نکلے گی۔ کیا وہ اس کے لیے تیار ہیں؟ آخر انہوں نے گزشتہ مردم شماری کے فارموں میں شامل علیحدہ کالم کو عین طباعت سے قبل اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے کیوں خارج کرایا تھا۔

آخر میں ایک اور وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ محرم کے ابتدائی دس دنوں میں ریڈیو اور ٹی وی کے فرقہ وارانہ پروگراموں کی وجہ سے عام مسلمان تو بالعموم ریڈیو ٹی وی بند کر دیتے ہیں یا دوسرے ملکوں کے تفریحی پروگرام سننے اور دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاں تک شیعہ حضرات کا تعلق ہے تو وہ ان دنوں میں نوحہ و ماتم میں مصروف رہنے کی وجہ سے ان پروگراموں کو بہت کم دیکھتے ہیں۔ یعنی ان دنوں میں سنی یا شیعہ کوئی بھی ان ذرائع ابلاغ سے استفادہ نہیں کرتا۔ ایسی صورت میں جبکہ ہمارے ریڈیو اور ٹی وی کے شیعی پروگراموں کو کوئی سنتا اور دیکھتا نہیں تو ان کو نشر کرنے کا مطلب صرف یہی لیا جا سکتا ہے کہ ان اداروں میں ایک غالی شیعہ اور شیعہ نواز طبقہ ایسا ہے جو ان پروگراموں کو نشر کر کے خود ثواب کمانا چاہتا ہے اور دنیا کو یہ تأثر دینا چاہتا ہے کہ پاکستان ایک شیعی مملکت ہے۔ ■■

وزیر اطلاعات کی ہدایات اور ٹی وی

اخباری اطلاعات کے مطابق جنرل مینجروں کی حالیہ کانفرنس میں وفاقی وزیر اطلاعات و نشریات نے یہ ہدایت دی کہ ٹی وی سے ایسے پروگرام پیش کئے جائیں جن سے اسلامی قدریں اجاگر ہوں اور پاکستان کے فکری و اساسی نظریات کو تقویت ملے تاکہ ان سے نوجوانوں میں اسلام اور پاکستان کی ثقافت سے محبت پیدا ہو۔ لیکن اس ہدایات کی سیاہی بھی خشک نہ ہونے پائی تھی کہ ۲ ستمبر ۹۰ء کو ایک انگریزی پروگرام "فال گائے" پیش کیا گیا۔ جس میں شروع سے آخر تک کیاسنو میں ایک خاتون عریاں ناچ اور چند نوجوان بیہودہ انداز میں ڈسکو ڈانس پیش کر رہے تھے۔ یہ سلسلہ اس فلم کے تقریباً پورے دورانیہ میں جاری رہا۔ اگر وزیر موصوف اس کی ریکارڈنگ خود ملاحظہ کریں تو اس کا صحیح اندازہ ہو جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ حکومت پر اس مؤثر ذریعۂ ابلاغ پر تہذیب و اخلاق کے دشمن افراد کا کنٹرول ہے جو احکام اسلام آباد سے چلتے ہیں ان کو ٹی وی اسٹیشن کے ارباب اختیار اکثر نظر انداز کر دیتے ہیں اور اپنی اور اپنے ہم مسلک و ہم مزاج احباب کی ذہنی آسودگی کی خاطر ممکنہ حد تک اسلامی قدروں کی پامالی کا اہتمام کرتے رہتے ہیں۔ کیا وزیر محترم اپنی ہدایات کو درخور اعتنا نہ سمجھنے والے ٹی وی حکام کے خلاف ایسے سخت اور مناسب اقدامات کریں گے تاکہ یہ ادارہ عوام کے اسلامی جذبات کی صحیح عکاسی کر سکے۔ (ایس بی ملک۔ کراچی)

ٹی وی کی من مانیاں اور ریشہ دوانیاں

ملک میں یوں تو حکومت کا ہر محکمہ اپنی اپنی جگہ پر من مانی کرتا نظر آتا ہے اور ایک عام بدنظمی اور بے ضابطگی کی لہر چلی ہوئی ہے لیکن اس نہج پر چلنے والے محکماتی من مانی میں ٹی وی نے تمام دوسرے سرکاری محکموں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے اور پورے زور شور اور شعوری جدوجہد کے ساتھ ملک میں بے راہ روی، بد اخلاقی اور اباحت کے نفوذ تیز دینی شعائر سے دوری پیدا کرنے کی سعی میں معروف ہے۔

دینی پروگراموں کو اول تو وقت ہی کم دیا جاتا ہے اس کو اس طرح تقسیم کیا جاتا ہے کہ اس کا بیشتر حصہ غیر ضروری بے کار اور دوسرے ایسے پروگراموں میں بٹ جائے جس سے عوام کو ضروری دینی تعلیم بھی نہ ملنے پائے اور گلوکاری کی ترویج کی جو مہم جاری ہے اس کو بھی تقویت ملے فہم القرآن کے عنوان کی آڑ لے کر درس دینے والے مخصوص حضرات کو پورا موقع فراہم کیا گیا ہے کہ وہ قرآن کریم کی مختلف متفرق آیات کے ٹکڑے لے کر اور سیاق و سباق سے الگ کر کے اپنے مسلک کی اگر بہ راست اور پوری تبلیغ نہ بھی کر سکیں تو سامعین کے اذہان کو کسی حد تک اپنے طریقِ فکر پر ڈال دیں چنانچہ ۱۹۸۵ء کے ۵۲ ہفتوں میں سے ۱۱ ہفتوں کے فہم القرآن میں ایک ہی مکتب فکر و دینی مسلک کے علما کو تقریر و تشریح کا موقع دیا گیا اور ۱۹۸۶ء کے اب تک (۲۹ اگست تک) ۸/۲ سال میں ۳۳ ہفتوں میں سے ۱۶ میں انہی مخصوص حضرات کو مدعو کیا گیا اور ایک ہفتہ میں کوثر نیازی صاحب کو نوازا گیا جن کی دینداری کا معیار سب کو معلوم ہے ارباب ٹی وی نے دوسری من مانی اور دیدہ دلیری یہ کی کہ پچھلے محرم کے دس دنوں میں محرم کی مجالس، محافل، مسالموں، مکالموں اور مراثی و تقاریر کو مجموعی طور پر پندرہ گھنٹے دیئے اور اس کے مقابلے میں رسول مقبولؐ کی سیرت طیبہ کے بیان اور اس سلسلے کی تقاریر وغیرہ کے لیے ۱۲ دنوں میں کل ۴/۱ گھنٹہ دیئے۔

یہ ہے وہ اسلام جس کی ٹی وی ترویج کر رہا ہے۔

(سید محمد عمر

۵۰ درخشاں. کراچی، ۳)

(بشکریہ ہفت روزہ "تکبیر" کراچی)

ڈاکٹر اسرار احمد

کی تالیف

استحکامِ پاکستان

اشاعت عام ۲۰/۱۲ روپے

پاکستان کیوں بنا ـــــ کیسے بنا
پاکستان کیوں ٹوٹا ـــــ کیسے ٹوٹا
اب ٹوٹا تو ـــــ
پاکستان کی تاریخ کا حقیقت پسندانہ تجزیہ
اندھیروں میں امید کی ایک کرن
لفظ لفظ میں ـــــ وطن کی محبت
سطر سطر میں ـــــ ایمان کی چاشنی
عمل کا پیغام ـــــ

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن
فون: ۸۵۲۶۱۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ

ایک اور اعزاز

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے گزشتہ سالوں کی طرح ۸۳-۱۹۸۲ء کے دوران
بھی ہماری بہترین برآمدی کارکردگی اور وطن عزیز کے لیے کثیر زرمبادلہ کمانے پر فیڈریشن آف
پاکستان چیمبرز آف کامرس اینڈ انڈسٹری کی جانب سے ہم ایک بار پھر

بہترین برآمدی کارکردگی کی ٹرافی

کے مستحق قرار پائے

یہ ٹرافی جناب جنرل محمد ضیاء الحق صاحب صدر پاکستان نے ایک پُروقار تقریب میں اپنے ہاتھوں سے ہمیں عطا فرمائی۔

ہمیں خیمے۔ ترپالیں اور کینوس کی دیگر مصنوعات کے سب
سے بڑے برآمد کنندگان ہونے کا بجاطور پر شرف حاصل ہے۔

SNDS

حاجی شیخ نورالدین اینڈ سنز لمیٹڈ

پاکستان میں کینوس مصنوعات کے سب سے بڑے برآمد کنندگان

ہیڈ آفس: حفیظ چیمبرز - ۸۵ - شاہراہ قائد اعظم، لاہور (پاکستان)
فون: ۳۰۶۴۶۸ - ۳۰۵۴۶۹، تار: شاہی خیمہ ٹیلکس: 44543 NOOR PK
ایکسپورٹ آفس: ۶۱۴-۶۱۶ کامرس سینٹر، چھٹی منزل، حسرت موہانی روڈ۔ کراچی (پاکستان)
فون: ۲۱۳۵۴۰ - ۲۱۴۳۹۷، تار: 'TARPAULIN' ٹیلکس: 25480 NOOR PK

Regd. L. No. 7360

MONTHLY "MEESAQ" LAHORE

Vol. 35	NOVEMBER 1986	No. 11

بعثتِ انبیاء و رسل کا اساسی مقصد ——— اور
بعثتِ محمدی کی تمامی و تکمیلی شان ——— نیز
انقلابِ نبوی کا اساسی منہاج ———

ایسے اہم موضوعات پر

ڈاکٹر اسرار احمد

کی

حد درجہ جامع تصنیف

نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت

کا مطالعہ کیجیے

اعلیٰ سفید کاغذ ○ عمدہ طباعت ○ قیمت فی نسخہ ۵ روپے

مرکزی انجمن خدام القرآن